اچھی کتابیں، کم قیمت

ایک مرد

سعادت حسن منٹو

بزم ادب لائبریری

3.00

ظفر احمد قریشی اینڈ سنز لاہور

ایک مرد

سعادت حسن منٹو

ظفر برادرز، مظفر منزل بنک سکوائر
دی مال لاہور

جملہ حقوقِ محفوظ ہیں دائمی بحق مالکینہ ظفر برادرز
محفوظ ہیں

تعداد .... ایک ہزار
قیمت .... تین روپے
طباعت .... پاکستان ٹائمز پریس لاہور

ناشر .... ظفر برادرز لاہور

سول ایجنٹ عرفان پبلشرز صدر بازار لاہور کینٹ

فہرست

ایک مرد ۴
شیرو ۳۳
قانون کی حفاظت ۴۷
بلاؤز ۶۲
دو ہزار سال بعد ۸۱
آم ۸۵
تین انگلیاں ۹۸
مس فریا ۱۲۵
غسل خانہ ۱۴۷
خونی تھوک ۱۶۰
تحفہ ۱۷۶
مسز ڈی سلوا ۲۰۴
تین تحفے ۲۱۸

ایک مرد

پہلا منظر

زنانہ کالج کے ہوسٹل کا ایک کمرہ ـــــ مختصر ساز و سامان، لیکن ہر چیز سلیقے اور قرینے سے رکھی نظر آتی ہیں کمرے کے دو حصے ہیں ایک آگے دوسرا پیچھے بیچ میں دیوار ہے لیکن اس میں دو بڑے بڑے بغیر کواڑوں کے دروازے ہیں ان میں سے ایک سے کمرے کا دوسرا حصہ نظر آتا ہے اور وہ کھڑکی بھی دکھائی دیتی ہے جو دوسری طرف میدان میں کھلتی ہے. کمرے کے دوسرے حصے میں پلنگ بچھا ہے اس کے پاس تپائی رکھی ہے. کھڑکی کے پاس آرام کرسی پڑی ہے. کمرے کے پچھلے حصے یعنی پیش منظر میں سنتوش ایک کرسی پر بیٹھی اور دوسری کرسی پر ٹانگیں رکھے کتاب پڑھنے میں مصروف ہے ـــــ اس دروازے پر جو ہوسٹل کی غلام گردش کی طرف کھلتا ہے. دستک ہوتی ہے.

سنتوش:۔ آجاؤ ـــــ دروازہ کھلا ہے.

(دروازہ کھلتا ہے. سنتوش کی سہیلی عذرا داخل ہوتی ہے.)

عذرا: کیا پڑھ رہی ہو؟

سنتوش: کچھ کہنا ہو تو فوراً کہہ دیا کرو۔ تمہیدیں نہ باندھا کرو۔ بولو کیا چاہتی ہو؟

عذرا: نوج تم سے کوئی بات کرے۔ ہر وقت منہ سجائے بیٹھی رہتی ہو۔

سنتوش: میں گھر سے یہاں پڑھنے آتی ہوں۔ تفریح کرنے نہیں آئی۔

عذرا: جی!

سنتوش: جی!!

عذرا: جی۔ ایک صرف آپ ہی گھر سے یہاں پڑھنے آئی ہیں باقی سب تفریح کی غرض سے آئی ہیں۔ ایسی سٹری بسی بات کرتی ہو کہ جی چاہتا ہے تم سے لڑنا شروع کر دوں۔ یہ تمہارے چہرے پہ جو سنجیدگی اور متانت کا غلاف چڑھا رہتا ہے ایک ہی جھٹکے میں اتار دوں۔

سنتوش: تین برس گذر جانے پہ بھی تمہارا یہ ادارہ مضبوط۔ اس کی وجہ؟

عذرا: تمہارا سر۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اُس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہوتا ہے؟ وہ کیوں ہوتا ہے؟ ہر بات میں قانون کی ایک بچ لگی رہتی ہے۔ وجہیں دریافت کی جا رہی ہیں۔ اسباب تلاش کیئے جا رہے ہیں۔ جانے اس شریف آدمی کا کیا حال ہوگا جو تم سے شادی کرنے کی حماقت کرے گا۔

سنتوش: وہی جو احمقوں کا ہوتا ہے۔

عذرا: سو وہ کوئی احمق ہی ہوگا جو تم سے شادی کرے گا ــــ یہ میری بات اچھی طرح نوٹ کرلو۔ تم عقل مند ہوگئی ہو کہ کسی دوسرے کی عقل تم سے برداشت نہ ہو سکے گی۔

سنتوش: عذرا دیکھو۔ میرا وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے یہ سارا جیبیٹر زبانی یاد کرنا ہے۔ جو کہنا ہے کہہ ڈالو اور جاؤ۔

(کرسی پر سے ٹانگیں ہٹا لیتی ہے۔ عذرا اس کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔)

عذرا: توبہ ــ تم تو یہ چاہتی ہو کہ ادھر بٹن دباؤ اور ادھر ساری بات نکل کر باہر آ جائے ــــ بھئی مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ میں تو اپنی عادت کے مطابق آہستہ ہی سب کچھ بتاؤں گی۔ تم بیٹھی پروٹسٹ کرتی رہو۔

سنتوش: لے اب جو کہنا ہے کہہ بھی ڈالو۔

عذرا: ایک خط آیا ہے۔

سنتوش: گھر سے ــــ شادی وادی کی بابت ؟

عذرا: نہیں ــ اباجی دوسری شادی کر کے مجھے تو بھول ہی گئے ہیں۔ اب اگر میں انہیں لکھوں ــ "اباجی میرا جی چاہتا ہے کہ لاماؤں کی سرزمین تبت میں چلی جاؤں اور وہاں کسی خانقاہ میں راہبہ بن جاؤں تو وہ یقیناً خوش ہو کر جواب دیں گے "بیٹا یہ تمہارا خیال بہت ہی مبارک ہے۔"

سنتوش: (ہنستی ہے) اس قدر ناامید نہیں ہونا چاہیے ــــ ہاں تو خط اگر گھر سے

نہیں آیا تو کہاں سے آیا ہے ؟

عذرا :۔ جانے کہاں سے آیا ہے پتا درج نہیں ـــ لفافے پر میرا نام ہے۔
لیکن خطاب ہوسٹل کی تمام لڑکیوں سے کیا گیا ہے ـــ میں بھولی۔صرف
خوبصورت لڑکیوں کے نام۔

سنتوش :۔ لکھنے والا کون ہے ؟

عذرا :۔ ایک مرد۔

سنتوش :۔ بالغ یا نابالغ ؟

عذرا :۔ معلوم نہیں۔لیکن تحریر سے کافی بلوغت ٹپکتی ہے۔

سنتوش :۔ نام ؟

عذرا :۔ وہی ایک مرد

سنتوش :۔ اور ہمارے ہوسٹل میں بارہ لڑکیاں ہیں۔

عذرا :۔ بارہ نہیں تیرہ

سنتوش :۔ تیرہ کیسے۔

عذرا :۔ ایسے اتفاق سے تم بھی لڑکی ہو۔

سنتوش :۔ تو ایک مرد نے ہم تیرہ لڑکیوں کے نام یہ خط بھیجا ہے۔

عذرا :۔ غلط ـــ صرف ان کے نام جو اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتی ہوں۔

سنتوش :۔ اس کا مطلب ؟

عذرا :۔ (اپنے بلاؤز میں سے ایک خط انگلیوں کی مدد سے نکالتی ہے) تم یہ خط پڑھو
(خط سنتوش کو دے کر باہر جانے لگتی ہے۔)

سنتوش :۔ تم کہاں چلیں ؟

عذرا :۔ صفیہ کو بلا لاؤں۔

سنتوش :۔ صفیہ حسن کو۔

عذرا :۔ نہیں دوسری صفیہ کو ۔۔ صفیہ حسن تو بیاہی ہوئی ہے (وقفہ) سنتوش
میں کہتی ہوں ہوسٹلوں میں صرف بیاہی ہوئی عورتیں داخل کرنی چاہئیں

سنتوش :۔ کیوں ؟

عذرا :۔ اس لئے کہ ہسپتالوں سے زیادہ ملتے جلتے ہیں اور تم جانتی ہو کہ بیاہی
ہوئی عورتیں اکثر بیمار رہتی ہیں (ہنستی ہے) اب ذرا تم بھی ہنس دو۔

سنتوش :۔ کسی کے کہنے پر میں کبھی نہیں ہنس سکتی۔

عذرا :۔ تو جہنم میں جاؤ ۔۔ !

(چلی جاتی ہے)

سنتوش :۔ (خط پڑھتے ہوئے) ہاں جاؤ۔ پر جلدی واپس آ جانا۔

(کچھ دیر تک سنتوش خط پڑھنے میں مصروف رہتی ہے۔)

ورشا :۔ (آواز باہر سے آتی ہے) میں اندر آ سکتی ہوں۔

(ورشا اور عذرا دونوں اندر داخل ہوتی ہیں)

عذرا:۔ آؤ ۔۔ آؤ ۔۔ ورشا آؤ ۔۔۔ دیکھو تم یہاں بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔

ورشا:۔ کیا بات ہے؟ ۔۔۔ بڑی گھبرائی ہوئی ہو۔

(کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

عذرا:۔ سنتوش سے پوچھو ۔۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دے گی۔

(چلی جاتی ہے)

ورشا:۔ یہ خط بڑی دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے۔

سنتوش:۔ (سرگوشی میں دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) عذرا گئی۔

ورشا:۔ گئی ۔۔۔ کیا بات ہے؟

سنتوش:۔ بتاتی ہوں ۔۔۔ مجھے ایک شرارت سوجھی ہے۔

ورشا:۔ شرارت؟

سنتوش:۔ ہاں شرارت۔ عذرا اور دوسری لڑکیاں ہمیشہ شکایت کرتی تھیں کہ میں بہت سنجیدہ اور متین ہوں۔ سو کل بیٹھے بیٹھے مجھے ایک شرارت سوجھی ۔۔ کوئی سن تو نہیں رہا ۔۔۔ ہاں تو میں نے ایک شرارت کی اور یہ خط لکھ کر عذرا کے نام ڈال دیا ۔۔۔ اب عذرا اس میں بڑی دلچسپی لے رہی ہے میں تمہیں پوری بات سناتی، پر کوئی آجائے گا ۔۔ یہ خط پڑھ لو

(خط اس کے حوالے کرتی ہے ۔۔۔ اور اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

ورشا:۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔

سنتوش:۔ مجھے خود معلوم نہیں کہ خط لکھنے سے میرا مطلب کیا تھا۔ لیکن دیکھو ورشا کسی سے کہنا نہیں ورنہ سارا لطف جاتا رہے گا۔

ورشا:۔ (خط پڑھتے ہوئے) یہ تمہیں کیا سوجھی

سنتوش:۔ دراصل ورشا میں اپنی سنجیدگی اور متانت سے تنگ آگئی ہوں جی چاہتا ہے کہ اب کوئی ہنگامہ ہو۔

ورشا:۔ (توقف کے بعد) . . . . خط دلچسپ ہے۔

(غلام گردش سے تیز قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ اور فوراً ہی عذرا آٹھ دس، لڑکیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوتی ہے۔

عذرا:۔ ہے نا — میں ان سب سے ابھی یہی کہہ رہی تھی۔

عذرا:۔ (لڑکیوں سے) آجاؤ۔ سب کی سب اندر چلی آؤ — اختری تمہارا یہ خبطی پن اچھا نہیں لگتا — چلی آ — تمہیں اپنی ناک کی کیل سے جتنا پیار ہے اگر اتنا ہی مجھ سے ہوتا تو . . . . .

اختری:۔ تم ہر وقت میری اس کیل کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔

عذرا:۔ میں پوچھتی ہوں کہ بھلا کوئی یہ بھی زیوروں میں زیور ہے — اچھی بھلی ناک میں کیل گاڑ دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ کیا لٹکاؤ گی۔

(کئی لڑکیاں ہنستی ہیں)

عذرا:۔ (ہنستے ہوئے) آؤ۔ بھئی آؤ — مذاق برطرف — اختری کی

کیل سے یہ خط زیادہ اہم ہے۔

(کچھ لڑکیاں کھڑی رہتی ہیں۔ کچھ کرسیوں اور میزوں پہ بیٹھ جاتی ہیں)

ورشا:۔ اہم وہم تو خاک بھی نہیں — کوئی مرد ذرا سی بات کہہ دے تو تم اُسے خواہ مخواہ اہمیت دینا شروع کر دیتی ہو — جانے نگوڑا کون ہے۔ کون نہیں ہے۔

عذرا:۔ تو چھوڑ — خط میرے حوالے کر دو۔ اتنی دلچسپی سے پڑھ کیوں رہی ہو۔ کتنی بھولی بنتی ہے۔ چہرے پہ بالوں کی لٹیں ہر وقت یوں لٹکائے رکھتی ہے جیسے بہری بنو کو دنیا کا کچھ پتہ ہی نہیں — لاؤ خط مجھے دو (خط چھین لیتی ہے)

صفیہ:۔ (آگے بڑھ کر) .... یہ تم دونوں نے لڑنا کیوں شروع کر دیا۔ یہاں بلایا ہے تو کچھ ہمارے پلے بھی پڑے۔

عزت:۔ تم اب اپنا نخرہ کرنا بند کر دو — تو یہ اچھی ہے تو معلوم ہوتا ہے۔ تو مجھ سے رہی کا ہے — چلو اب خط سناؤ۔

عذرا:۔ تمہیں سننے کی کیا ضرورت ہے۔ اس عینک میں سے تم لفافوں کے اندر کا مضمون بھی پڑھ لیا کرتی ہو۔

(بہت سی لڑکیوں کا شور — خط سنایا جائے — خط سنایا جائے)

عذرا:۔ (تقریر کے انداز میں) .... خاموش — خاموش — ورشا تم سنتوش

سے کیا کھسر پھسر کر رہی ہو؟ خاموش رہو — بہنو، میں نے تمہیں سنتوش کے میں اس لئے بلایا ہے کہ مجھے آج ایک مرد کی طرف سے یہ خط وصول ہوا ہے۔

عزت:۔ (خوش ہو کر) ...... ایک مرد کی طرف سے

نرملا:۔ اتنی خوش کیوں ہوتی ہو؟

عذرا:۔ خاموش — اس میں خوشی کی کوئی بات نہیں — یہ خط وصول ہوا ہے میں آپ کو سنا دیتی ہوں خوشی اور غمی کا فیصلہ بعد میں کیا جائے اسرلا اور بملا تم دونوں بہنیں مجھے یوں گھور گھور کے کیوں دیکھ رہی ہو؟

سرلا اور بملا:۔ (دونوں) نہیں تو۔

عزت:۔ عذرا تم خط سناؤ۔

عذرا:۔ لو سنو — (خط کا کاغذ کھولتی ہے) ..... ہوسٹل کی تمام خوبصورت لڑکیو..... (لڑکیوں کی سرگوشیاں)

عذرا:۔ رشیدہ تم غور سے سنو..... ہوسٹل کی تمام خوبصورت لڑکیو.....
(اضطراب کی آوازیں)

عذرا:۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟

خورشید:۔ رشیدہ کمنی ہے۔ میں اب یہاں نہیں بیٹھوں گی۔

سنتوش:۔ عذرا تم نے اسے کیوں چھیڑا — کیا ہے بیچاری کی شکل میں — تم سے

تو لاکھ درجے اچھی ہے

صفیہ :۔ تم خط سناؤ جی۔ یہ بیکار کی باتیں کیا لے بیٹھی ہو۔

عذرا :۔ ہوسٹل کی تمام خوبصورت لڑکیو ——— میری دعا ہے کہ شادی کے بعد بھی تمہاری خوبصورتی برقرار ہے۔

عزت :۔ آدمی شریف معلوم ہے۔

(چند لڑکیاں ہنستی ہیں)

عذرا :۔ تم ضرور لفظ شادی سے گھبراؤ گی۔ تم میں سے بعض میں یہ گھبراہٹ اصلی ہو گی اور بعض میں مصنوعی۔ مرد مصنوعی اور اصلی گھبراہٹ پسند کرتے ہیں ضرور گھبراؤ۔ لیکن کاش تم شادی کے بعد بھی گھبرا سکیں۔

اختری :۔ ہے ہے ——— یہ نگوڑا کس قسم کا آدمی ہے ——— کیا اوٹ پٹانگ لکھا ہے۔ گھبراؤ ——— ضرور گھبراؤ —

خورشید :۔ گھبرائے تمہاری بلا ——— تم تو اس دن کی انتظار میں . . . .

اختری :۔ چپ کر موٹی زبان دراز

عذرا :۔ خاموش . . . . . . ہاں تو آگے لکھا ہے . . . . یہ خط میں صرف خوبصورت لڑکیوں کو لکھ رہا ہوں —

(سرگوشیاں)

صفیہ :۔ کیوں خوبصورت لڑکیاں اس مردوے کی خالہ کی خلیّجی لگتی ہیں۔

اختری: تم کیوں چڑتی ہو۔

عذرا:۔ (خط پڑھتے ہوئے) یہ خط میں صرف خوبصورت لڑکیوں کو لکھ رہا ہوں اس کا جواب اگر مجھ سے طلب کیا جائے تو میں کہوں گا۔

سورن لتا:۔ کیا کہے گا؟۔

عذرا:۔ کہ عورت میں جیسے دنیا میں بڑے بڑے کام سر انجام دینا ہوتے ہیں خوبصورتی کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اگر عورت خوبصورت نہیں تو وہ تو وہ ایسا کمرہ ہے جس میں کوئی روشندان نہ ہو۔

سرلا:۔ آگے کیا لکھا ہے؟

صفیہ: آگے کیا لکھا ہے تمہارا سر ——— ذرا اس کی طرف دیکھو۔ اختری کتنی دلچسپی لے رہی۔ وہ موا گالیاں دے رہا ہے ہمیں ——— اور یہ مزے سے سن رہی ہے۔

عذرا:۔ خوبصورتی ازدواجی زندگی کے تنفس کے لئے اشد ضروری ہے۔ یہ پڑھنے کے بعد تم میں سے اکثر اپنے آپ سے سوال کریں گی "کیا میں خوبصورت ہوں؟"

اختری: صفیہ تو ضرور کرے گی۔

صفیہ:۔ پہلے میں اس یوسف کو نہ دیکھوں گی جو لوگوں کی خوبصورتی ناپتا پھرتا ہے (تین چار لڑکیاں ہنسی)

عذرا: تم میں سے اکثر بے وقوف لڑکیاں آئینے کی گواہی طلب کریں گی۔

صفیہ:۔ (غصے میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

عذرا:۔ اس سے کہو کہ منہ سنبھال کر بولے۔

(عذرا اور تینوں چار لڑکیاں ہنسی)

سنتوش:۔ آرڈر ــــ آرڈر۔

عذرا:۔ (خط پڑھتے ہوئے) اپنے حافظہ پر زور دے کر ایسے واقعات تلاش کریں گی جنہوں نے کبھی ان کی خوبصورتی یا بدصورتی کا فیصلہ کیا ہوگا ــــ سچ پوچھو تو عورت اپنی خوبصورتی یا بدصورتی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی ــــ اس کی خوبصورتی یا بدصورتی کا فیصلہ کرنے والے ہم ہیں یعنی مرد۔

صفیہ:۔ گدھے کہیں کے۔

سنتوش:۔ تم بہت جلد بگڑ جاتی ہو۔

ورشا:۔ (ہنس کر) اس قدر غصہ۔

صفیہ:۔ غصہ کیوں نہ آئے ــــ بات ہی ایسی ہے ــــ نامعقول کہیں کا ــــ خیر بتاؤ آگے کیا لکھا ہے؟

عذرا:۔ تمہارے گالوں پر زخم کا نشان جو بظاہر بدصورت معلوم ہوتا ہے کسی مرد کی نگاہوں میں تمہاری خوبصورتی کا باعث ہو سکتا ہے (صفیہ اپنے گال کے داغ کو چھپا لیتی ہے) تمہارا توتلا پن تمہارا تھوڑا سا لنگڑا کر چلنا تمہارا ضرورت سے زیادہ بھولا پن جس سے شاید تمہارے ماں باپ نالاں ہوں

تمہارا ٹوٹا ہوا دانت، تمہاری شکن آلود پیشانی، تمہارے موٹے ہونٹ جن کی بدصورتی کے متعلق دل ہی دل میں تم نے کئی بار سوچا ہوگا۔ تمہیں خوبصورت بنانے میں بیش از بیش حصہ لے سکتے ہیں۔

رشیدہ:۔ (طنز کے ساتھ) تمہارے مڑے ہوئے دانت تمہاری تنگ پیشانی تمہارا کٹا ہوا بازو۔ تمہاری پھولی ہوئی توند تمہاری گاجر برابر چوٹی اور تمہارے سوجے ہوئے نتھنے۔ تمہیں خوبصورت بنانے میں بیش از بیش حصہ لے سکتے ہیں — مجھے تو یہ کوئی سڑی دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔

عذرا:۔ آگے سنو — ہم آرٹسٹ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت نے تمہیں صرف ہمارے پاس بھیجا ہے کہ ہم تمہاری نوک پلک نکالیں۔ تمہیں خوبصورت بنائیں تمہارے اندر یہ احساس پیدا کریں کہ تم خوبصورت ہو۔ اگر ہم نہ ہوتے تو بہت ممکن ہے چاند اور تارے تم پر بازی لے جاتے مگر چونکہ ہم ہیں اس لئے آسمانوں اور زمینوں کی تمام خوبصورتیاں نوچ کر ہم نے تمہارے قدموں میں ڈال رکھی ہیں۔

صفیہ:۔ محض بکواس ہے۔

نرملا:۔ خاموش بھی رہو۔

سرلا:۔ اس کی للو تو بس چلتی رہتی ہے۔

عذرا:۔ تم اس ہوسٹل کی چار دیواری میں قید ہو۔ فلسفے، ہندسے اور معاشیات کی یہ موٹی موٹی کتابیں رٹتی رہتی ہو تم میں سے کچھ فلسفے کی تیز شیشوں والی

عینک ہر وقت اپنی ناک پر چڑھائے رکھتی ہیں ۔۔۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ فلسفہ محض ڈھکوسلہ ہے زمان و مکاں کی بحث بالکل لایعنی ہے معاشیات کے اصول کسی کام کے نہیں ۔۔۔ دنیا کے نظام پر صرف ایک چیز حکومت کرتی ہے صرف ایک چیز اور وہ عورت اور مرد کی ازلی دوستی ہے ۔

ستری: ۔ بے خودی کے عالم میں ازلی دوستی ہے ۔

ندرا: ۔ تم مردوں سے دور کیوں رہتی ہو؟ ۔۔۔ نہیں دور ہی رہو ۔ اس لئے کہ تم دور رہنے پر زیادہ قریب آجاتی ہو ۔ تم دور رہ کر خود کو قریب محسوس نہ کیا کرو اس لئے کہ تمہارا یہ احساس اس قربت کا سارا لطف خراب کر دیتا ہے ۔ اس احساس سے صرف مرد ہی لطف اندوز ہوں تو اچھا ہے ۔

جمہ: ۔ دوری اور نزدیکی کا یہ گورکھ دھندا خوبصورت ہے ۔

ندرا: ۔ (شاعرانہ انداز میں) ۔۔۔۔ رات کو سوتے وقت جب تمہارے کنوارے دماغ فلسفے معاشیات اور جبر و مقابلہ کی دھند سے آزاد ہوں تو اپنے کمرہ کی لطیف فضا میں جو تمہارے وجود سے اور بھی لطیف ہو جاتی ہے کچھ دیر کے لئے سوچنا کہ مرد کیا ہے ۔۔۔ جب صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کالج جانے کے لئے زبردستی تمہاری مندی ہوئی آنکھیں کھول جائیں گی اور تمہارا دل و دماغ نیند کی دھنکی ہوئی روئی میں لپٹا ہوگا تو اس وقت بھی نیم غنودگی کی رات میں سوچنا کہ مرد کیا ہے (خورشید انگڑائی لیتی ہے) ۔۔۔۔ اندھیری یا چاندنی

راتوں میں جب تمہیں ہر شے پُراسرار دکھائی دے گی اور ایک بے نام سا اضمحلال تم پر طاری ہوگا۔ اس وقت بھی تم اپنے نرم سیر دماغ سے پوچھنا "مرد کیا ہے؟"

عزت:۔ (بے خود ہو کر تالی بجاتی ہے) بہت خوب۔ بہت خوب۔

ورشا:۔ سنتوش بھی کچھ بھی ہو — فقرہ بہت خوبصورت ہے — اندھیری یا چاندنی راتوں میں جب ہر شے پُراسرار دکھائی دے گی اور ایک بے نام سا اضمحلال تم پر طاری ہوگا۔ اس وقت بھی اپنے نرم سیر دماغ سے پوچھنا۔ "مرد کیا ہے؟" بہت اچھا فقرہ ہے۔

سنتوش:۔ آہستہ ورشا — چپ؟

عذرا:۔ ہوسٹل کی خوبصورت لڑکیو — وہ جو پھولوں میں نت نئے رنگ بھرتا ہے۔ وہی تمہاری جوانیوں میں رنگ بھرے — اگر تم اس خط کا جواب دینا چاہو تو لکھ کر اس بڑے پتھر کے نیچے رکھ دینا جو تمہارے ہوسٹل کی عمارت میں کام نہیں آسکا تھا۔ اور جواب باہر سڑک کے پاس بیکار پڑا ہے۔

راقم — ایک مرد۔

سرلا:۔ افسوس کے ساتھ ختم ہوگیا۔

صبیحہ:۔ کیا کوئی ناول پڑھ کر سنایا جا رہا تھا تمہیں؟

عذرا:۔ خاموش — بہنو خط آپ نے سن لیا ہے اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔؟

سنتوش:۔ تمہاری کیا رائے ہے۔

بہت سی لڑکیاں:۔ ہاں پہلے سنتوش اپنی رائے ظاہر کرے۔

سنتوش:۔ رائے ؟ ــــ میں ــــ میں کیا رائے دوں ــــ تم جو فیصلہ کرو گی مجھے منظور ہے۔

عزت:۔ عذرا ــــ میری رائے میں اس خط کا جواب ضرور دینا چاہیئے۔ اندھیری یا چاندنی راتوں صبح اٹھتے وقت یا رات سوتے وقت اپنے آپ سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ مرد کیا ہے ــــ میں سب جانتی ہوں کہ مرد کیا ہے؟

عذرا:۔ بتاؤ مرد کیا ہے؟

عزت:۔ مرد وہ جانور ہے جو کارکھنے پر بھی دودھ نہیں دیتا۔ جیسا چمگادڑ۔

صفیہ حسن:۔ مجھے تمہارا یہ مذاق پسند نہیں آیا۔

عزت:۔ اس لئے کہ تم اس قسم کی ایک چمگادڑ سے بیاہی ہو۔

(چند لڑکیاں ہنستی ہیں)

بملا:۔ میرا اور سرلا کا خیال ہے کہ اس خط کا جواب ایسی ہی میٹھی زبان میں دینا چاہیئے ــــ

اختری:۔ تو اتنی شکر تم دونوں بہنوں کی زبان میں ہے۔

عذرا:۔ کمل تم خمیرے آٹے کی طرح پھیلی ہوئی کیا سوچ رہی ہو۔ کچھ تم بھی بولو۔

کمل:۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔

عزت:۔ اسپرین کھاؤ۔

عذرا:۔ (خورشید کے پاس جاکر) خورشید تم ان معاملوں میں ماہر ہو۔ بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

خورشید:۔ (تنک کر) مجھے یہ چھیڑ طفلانی اچھی نہیں لگتی عذرا —— (لہجہ بدل کر اختری سے) خدا کی قسم جب سے اس نے یہ خط سنایا ہے۔ میرا دل ڈر کے مارے دھک دھک کر رہا ہے —— مجھے بڑی دہشت ہوتی ہے۔ ایسی باتوں سے۔

اختری:۔ (مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ) ابھی تم سے کہتی رکھو چکی بہن کہ اپنے دل کا علاج کراؤ —— ایسا نہ ہو کہ شادی کے روز مارے دہشت کے دل بند ہو جائے۔

(تینوں چار لڑکیاں ہنسی)

عذرا:۔ نرملا تمہارا کیا خیال ہے؟

نرملا:۔ میں اس معاملہ میں اپنی رائے محفوظ رکھنا چاہتی ہوں۔

عزت:۔ ریفریجریٹر میں رکھ چھوڑو۔

(چند لڑکیاں ہنستی ہیں)

عذرا:۔ درشا —— میری بھولی بھالی درشا تمہارا کیا خیال ہے۔

درشا:۔ میرا خیال ہے کہ صفیہ سے پوچھا جائے۔

عذرا:۔ لو صفیہ تمہاری کیا رائے ہے۔

صفیہ: تم کہو گی کہ مجھے مردوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ مگر سچ پوچھو تو اس خدا واسطے کے بیر کے بغیر کام بھی نہیں چل سکتا۔ میری رائے ہے کہ ہم سب مل کر ایک محاذ بنالیں، اس مرد کا کھوج لگائیں۔ جب کھوج لگ جائے تو سب مل کر اس پر حملہ کر دیں ــــ اگر آدمی اتفاق سے شریف نکل آیا تو ہم اسے معاف کر دیں گے۔ ــــ معاف کر دینے میں اور ہی لطف ہے

عذرا: تمہارا مطلب ہے کہ ہم اسے ماریں؟

صفیہ: یقیناً یہی میرا مطلب ہے۔

سرلا اور بملا: (ورتوں بیک زبان) یہ صریحاً ظلم ہے۔

عزت: مجھے بھی اس سے اتفاق نہیں ــــ ممکن ہے بیچارے کے کہیں چوٹ آجائے۔ تو تو بالکل ڈائن قصائن ہے۔

صفیہ: میں نے اپنی رائے ظاہر کر دی ہے۔ مانو نہ، تو تمہارا اختیار ہے۔ عذرا تمہارا کیا خیال ہے۔؟

سرلا: ہاں عذرا سے پوچھو اس کا کیا خیال ہے؟

عذرا: تم سب کی رائے طلب کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ خط کا جواب نہیں دینا چاہیئے لیکن دینا بھی چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ ضروری ہے۔ داس کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ یہی خط اس پتھر کے نیچے لکھ دیا جائے ــ کیا خیال ہے تمہارا عزت ــــ میں سمجھتی ہوں کہ یہ طریقہ سب سے

بہتر رہے گا۔

یعنی اس میں کوئی قطعی جواب نہیں ہے۔ ہاں بھی ہے اور نہیں بھی۔

عزت:۔ تمہارا خیال درست ہے۔

عذرا:۔ جنہیں یہ بات پسند ہے وہ اپنا ہاتھ کھڑا کر دیں۔

(چند لمحات سرگوشیاں ہوتی ہیں۔ پھر سب لڑکیاں اپنا اپنا ہاتھ کھڑا کر دیتی ہیں)

عذرا:۔ سب راضی ہیں —— سنتوش —— تم نے ہاتھ کھڑا نہیں کیا۔؟

سنتوش:۔ میں سمجھتی تھی کہ میں نے کر دیا ہوگا —— لو ——

(ہاتھ کھڑا کر دیتی ہے)

عذرا:۔ تو یہ طے ہے —— میرا پہلا پیریڈ خالی ہے۔ میں ابھی جا کر یہ خط اس پتھر کے نیچے رکھ دیتی ہوں۔

سرلا:۔ لیکن شام کے چھ بجے پھر جا کے دیکھنا۔ ممکن ہے کوئی نئی بات ....

(گھنٹے کی آواز)

بہت سی لڑکیاں:۔ چلو —— چلو —— اب بھاگو ——

(لڑکیاں دروازے کی طرف بھاگتی ہیں۔ صرف درشنا اور سنتوش کمرے میں رہ جاتی ہیں)

سنتوش:۔ (جب ساری لڑکیاں باہر چلی جاتی ہیں تو آہستہ سے) درشنا ——

اب کیا ہوگا!

ورشا:۔(ہنس کر) کیا ہوگا ــــ کچھ بھی نہیں ہوگا ــــ مجھے تو تمہاری اس شرارت میں کچھ مزا نہیں آیا۔

سنتوش:۔ عذرا اس پتھر کے نیچے خط رکھ آئے گی۔

ورشا:۔ تو تم ایک گھنٹہ بعد وہاں جا کر نکال لینا ــــ اس میں گھبرانے کی بات ہی کیا ہے؟ چلو اب چلیں۔

سنتوش:۔ چلو!

(دونوں چلی جاتی ہیں)

دوسرا منظر

(ہوسٹل کا وہی کمرہ جو ہم پہلے منظر میں دکھا چکے ہیں۔ کلاک چھ بجاتا ہے آہستہ آہستہ پردہ اٹھتا ہے اور سنتوش اضطراب کے ساتھ ٹہلتی دکھائی دیتی ہے چند لمحات کے بعد ایک دم دروازہ کھلتا ہے)

سنتوش:۔ پلٹ کر کون؟

(ورشا اندر داخل ہوتی ہے)

ورشا:۔ کیا بات ہے اس قدر پریشان کیوں ہو؟ خط لے آئی ہو وہاں سے؟

سنتوش:۔ لے آئی ہوں ــــ لو پڑھ لو۔

ورشا:۔ صبح پڑھ تو لیا تھا

سنتوش:۔ نہیں یہ دوسرا ہے۔

ورشا:۔ کیا کوئی اور لکھا ہے۔؟

سنتوش:۔ یہ سچ مچ کسی مرد کا لکھا ہوا ہے۔

ورشا:۔ ہائیں یہ کیا ہوا ؟

سنتوش:۔ کیا معلوم ــــ میں وہاں گئی تو پتھر کے نیچے میرے خط کے بجائے یہ کاغذ پڑا تھا۔

(اپنا خط ورشا کو دیتی ہے)

ورشا:۔ (خط لے کر بیٹھ جاتی ہے)...... اس عورت کے نام جس نے ایک مرد کی دلی کیفیات بڑی کامیابی سے بیان کیں (سنتوش سے) تو وہ بھانپ گیا۔

سنتوش:۔ ظاہر ہے۔

(پھر اضطراب کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیتی ہے)

ورشا:۔ کیا لکھا ہے۔؟ (پڑھتے ہوئے) اتفاق ہاں اتفاق سے تمہارا لکھا ہوا خط جو دل سے کم نازک نہیں۔ پتھر کے نیچے دبا ہوا ملا۔ میں نے اس کو نکالا اور پڑھا۔

سنتوش:۔ آہستہ پڑھو!

ورشا:۔ وہ مرد یقیناً خوش قسمت ہوگا جسے تمہاری رفاقت نصیب ہوئی۔
۔۔۔ اگر میں عورت ہوتا اور یہ خط واقعی کسی مرد کی جانب سے مجھے ملتا تو کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ میں کیا کرتا؟ (اپنی طرف سے) "کوئی ضرورت نہیں" (پھر خط پڑھتی ہے) تمہارے خط کا ایک ایک لفظ ایک پنکھڑی ہے جو مجھے تمہارے ہی سانس کے زیر دم سے لرزاں نظر آئی ۔۔۔ آدمی شاعر معلوم ہوتا ہے۔

سنتوش:۔ آگے پڑھو!

ورشا:۔ میں پہلے عورت کو ایک حل نہ ہو سکنے والا معما سمجھتا تھا۔ مگر تمہارے اس خط نے یہ مشکل آسان کر دی ہے۔ تمہارا خط خط نہیں بلکہ عورت کی وہ انگڑائی ہے جس کے کھچاؤ نے نسوانیت کے سارے خطوط میرے سامنے نمایاں کر دیئے ہیں۔ میں خوبصورت نہیں ۔۔۔ اس بات کا احساس مجھے ہمیشہ دکھ دیا کرتا تھا پر اب تمہارا خط پڑھ کر مجھے ڈھارس ہوتی ہے کہ مجھے خوبصورت بنانے والی کوئی نہ کوئی ہستی اس دنیا میں ضرور موجود ہے اور وہ ہستی عورت کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟ میں اس خط کا جواب نہیں چاہتا اس لئے کہ وہ کلی اس پتھر کے نیچے رکھ دیا جائے گا۔

راقم ۔۔۔۔۔ ایک مرد

سنتوش:۔ ادھر کونے پر کچھ اور بھی لکھا ہے (ورشا کو خط کا کونہ دکھاتی ہے)

ورشا:۔ ابھرتی ہے۔ ایں اپنے آپ کو چھپانا نہیں چاہتا۔ تم مجھے چھ بجے کے بعد پتھر کے آس ٹہلتا دیکھو گی ۔۔۔ چھ نو بج چکے ہیں۔ اور تمہاری اس کھڑکی میں سے تو سب کچھ نظر آتا ہے۔

وہ ۔۔۔ پتھر پڑا ہے۔

(کھڑکی میں سے باہر کوئی نظر نہیں آتا)

سنتوش:۔ آہستہ بولو کوئی سن لے گا۔

ورشا:۔ اگر اتنا ڈر تھا تو یہ خط وہاں سے اٹھایا ہی نہ ہوتا۔

سنتوش:۔ اٹھا لیا تو بعد میں خیال آیا۔

ورشا۔ تمہارا کیا خیال ہے، یہ خط کون لکھ سکتا ہے۔!

(اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے)

سنتوش:۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔۔۔ زیادہ حیران کرنے والی بات تو یہ ہے کہ اس پتھر کے نیچے اس کا ہاتھ کیسے پہنچ گیا ۔۔۔ کیسی کیسی جگہ ان لوگوں کا ہاتھ پہنچ جاتا ہے۔

ورشا:۔ خدا اچھا ہے۔

سنتوش:۔ ہاں برا نہیں ۔۔۔ پر ورشا کسی سے کہو مت ۔۔۔ اور دیکھو میں کیا کہہ رہی تھی ۔۔۔ ہاں تو ایسا نہ کریں کہ اس پتھر ہی کو یہاں سے اٹھوا دیں۔

ورشا:۔ اس سے کیا ہوگا؟

سنتوش:۔ ٹھیک ہے اس سے کیا ہوسکتا ہے ؟ ـــ ورشا !

ورشا:۔ کیا ؟

سنتوش:۔ اب کیا ہوگا ـــ میرا خط اس کے پاس ہے۔

ورشا:۔ اور اس کا تمہارے پاس۔

سنتوش:۔ اس سے کیا ہوتا ہے ؟ ـــ میں چاہتی ہوں کہ میرا خط مجھے واپس مل جائے ـــ ورشا ـــ دیکھو ـــ ادھر دیکھو۔ کھڑکی میں سے دور ایک مرد دکھائی دیتا ہے۔

ورشا:۔ ہاں۔ہاں ایک مرد۔ شاید وہی۔

(ورشا کمرے کے دوسرے حصے کی طرف جانا چاہتی ہے)

سنتوش:۔ کھڑکی کے پاس مت جاؤ۔ یہیں سے دیکھو (اُسے روک لیتی ہے اور آپ ادھر کا رخ کرتی ہے)

ورشا:۔ مجھے روکتی ہو اور آپ جارہی ہو۔

سنتوش:۔ نہیں تو ـــ لو میں بیٹھ جاتی ہوں۔ ادھر سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن نظریں کھڑکی کی طرف لگی رہتی ہیں ـــ ورشا اچھی طرح سے نظر نہیں آتا۔

ورشا:۔ تمہاری نظر کمزور ہے۔

سنتوش:۔(اپنے آپ پر جھنجھلا کر) عینک نہ جانے کب لگواؤں گی؟

ورشا:۔صاف نظر آتا ہے یہاں سے۔

سنتوش:۔(اٹھ کر اشتیاق بھرے لہجہ میں) کیسا؟

ورشا:۔ٹھہرو، مجھے اچھی طرح دیکھ لینے دو ۔۔۔ ہیٹ پہنے ہے۔

سنتوش:۔یہ تو میں بھی دیکھ سکتی ہوں۔

ورشا:۔ہیٹ پہنے ہے، قد چھوٹا ہے۔

سنتوش:۔نہیں ورشا اتنا چھوٹا نہیں۔

ورشا:۔بھئی ۔۔۔ میں تو اسے چھوٹا ہی کہوں گی۔عورت کے لئے اتنا قد ٹھیک ہے۔پر مرد تو کچھ اونچے ہی ہونے چاہئیں۔

سنتوش:۔اتنی دھوپ میں کھڑا ہے۔

ورشا:۔پیٹھ ہماری طرف ہے۔

سنتوش:۔ہاں سوچنے کی بات ہے ۔۔۔ ادھر منہ کیوں نہیں کرتا۔

ورشا:۔اسے کیا معلوم کہ تمہارا کمرہ اس طرف ہے۔

سنتوش:۔ٹھیک ہے ۔۔۔ پر ہوسٹل کی عمارت تو ادھر ہے۔ اسے ادھر ہی دیکھنا چاہئے۔

ورشا:۔ممکن ہے شرماتا ہے۔

سنتوش:۔اسے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔

ورشا:۔ کیوں ؟

سنتوش:۔ بڑی بدنامی کی بات ہے ــــ اگر کسی کو پتہ لگ جائے تو .....
..... بھئی میرا دل دھک دھک کر رہا ہے (ورشا کا ہاتھ اٹھا کر اپنے دل پر رکھتی ہے)

ورشا:۔ اس کو نہ دیکھو، کھڑکی بند کر دو۔

سنتوش:۔ یہ بھی تو نہیں کر سکتی ــــ ہوا ــــ ہوا ــــ ہوا ــــ بند ہو جائے گی۔

ورشا:۔ (شرارت کے ساتھ) ہاں ٹھیک کہتی ہو ــــ سانس لینا دشوار ہو جائے گا۔

سنتوش:۔ کب ادھر منہ کرے گا ــــ تم بھی مجھے کچھ نہیں بتاتی ہو اور ماسی طرح بیٹھے کئے کھڑا رہتا ہے ــــ دروازے میں سے چپکے سے عذرا اندر داخل ہو کر سنتوش اور ورشا کے پیچھے کھڑی ہو جاتی ہے

ورشا:۔ کیا بتاؤں تمہیں۔

عذرا:۔ (یک دم) .... یہ بتاؤ اس کا رنگ کیسا ہے ؟ دفعتاً سنتوش اور ورشا دونوں چونکتی ہیں اور کہتی ہیں کون ــــ عذرا ... ناک نقشہ کیسا ہے۔ ٹھوڑی کیسی ؟ ہونٹ کیسے ہیں۔ لباس کیسا ہے، طبیعت کیسی ہے۔ تو یہ سب باتیں کوئی مجھ سے پوچھے۔

سنتوش (کھسیانی ہنسی) .... کہ ـــ کہ ـــ کہ کیسی باتیں ؟

عذرا۔ یہی معصوم باتیں کہ وہ کیسا ہے کیا کرتا ہے ـــ بھی ایسی باتیں معلوم کرنی پڑتی ہیں۔

سنتوش۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی (ایک طرف ہٹ جاتی ہے۔)

عذرا۔ اس کی کیا ضرورت ہے ؟

سنتوش ۔ جانے کیا اوٹ پٹانگ بکتی ہو۔

عذرا۔ ایسے بنتے کسی اور کو دو ـــ خط لکھ کر مقررہ وقت پر جب کوئی مرد بڑے بڑے پتھروں کے پاس ٹہلتا ہو تو کیسے معلوم نہیں ہو جاتا کہ بات پگھلنے والی موم کی ہے (ہنسی ہے) گھبرا کیوں گئیں ؟

سنتوش ۔ (گھبرا کر) کیسا خط ـــ پتھر ـــ کونسا پتھر ـــ میں ـــ میں، کہاں ہے وہ مرد ؟ ـــ دیکھو ـــ (مرد ایک طرف ہٹ جاتا ہے اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔)

عذرا۔ تمہاری کھڑکی کے پاس چلا آئے گا گھبراتی کیوں ہو ـــ میری بھولی بھالی ورشا تمہارا کیا خیال ہے ؟

ورشا۔ تم جانو اور یہ جانے، بھئی مجھے کچھ پتہ نہیں۔

دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔

عذرا: تمہاری مرضی۔

(کھڑکی پر دستک ہوتی ہے)

عذرا۔ لو وہ آ گیا۔

سنتوش:۔ (سخت گھبرا کر) اب میں کیا کروں ـــــ عذرا پرماتما کے لئے کچھ کرو ـــــ میں ـــــ میں ورشا ـــــ ورشا ـــــ یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا؟ (پھر دستک ہوتی ہے)

عذرا۔ ورشا اور عذرا کیا کرے ـــــ اب اس سے ملو۔

سنتوش:۔ مگر عذرا میں نے اسے نہیں بلایا ـــــ پہلا خط میں نے شرارت کے طور پر لکھا تھا لیکن مجھے پتہ نہیں تھا کہ سچ مچ کوئی مرد پتھر سے نکل آئیگا ـــــ اب پرماتما کے لئے کچھ کرو۔

عذرا:۔ بھئی میں کچھ نہیں کر سکتی۔

(دستک ٹک ٹک۔ ٹک)

آواز:۔ (کھڑکی میں سے آتی ہے) کیا میں سامنے آسکتا ہوں؟

عذرا:۔ آجاؤ۔

سنتوش:۔ یہ تم نے کیا غضب کیا؟

(بھاگنے لگتی ہے لیکن عذرا اسے پکڑ لیتی ہے۔)

عذرا۔ خاموش رہو۔

(چند لمحات مکمل خاموشی میں گذرتے ہیں۔ پھر ایک دم صفیہ کھڑکی میں سے

نظر آتی ہے مردانہ کپڑے پہنے)

صفیہ:۔ (شرارت کے ساتھ) آداب عرض کرتا ہوں۔

سنتوش:۔ کون؟ صفیہ۔

عذرا:۔ صفیہ نہیں ——— ایک مرد

صفیہ:۔ بھئی سنتوش۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ یہ مجھے مردوں کا لباس پہنا کر پتھر کے پاس کھڑا کرنے والی عذرا ہے

سنتوش:۔ تو ——— تو ——— یہ خط . . . . ؟

عذرا:۔ میں نے لکھا تھا ——— جس طرح پہلا خط تم نے لکھا تھا۔

(سب قہقہے لگاتی ہیں)

(بہت سی لڑکیاں ایک دم اندر داخل ہوتی ہیں اور شور مچانا شروع کر دیتی ہیں۔ سنتوش ان میں گھبر جاتی ہے)

(پردہ)

شیرو

چھپر اور دیوار کے ناہموار تختوں کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ جسے چھپی چھوبیرا کہنا بجا ہے۔ دو منزلیں تھیں۔ بھٹیار خانہ تھا۔ جہاں کھانا پکایا اور کھلایا جاتا تھا۔ اور بالائی منزل مسافروں کی رہائش کے لئے مخصوص تھی یہ منزل دو کمروں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ایک کافی کشادہ تھا۔ جس کا دروازہ سڑک کی طرف کھلتا تھا۔ دوسرا کمرہ جو طول و عرض میں اس سے نصف تھا بھٹیار خانے کے عین اوپر واقع تھا۔ یہ میں نے کچھ عرصے کے لئے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ چونکہ ساتھ والے حلوائی کے مکان کی ساخت بھی بالکل اسی مکان جیسی تھی اور ان دونوں جگہوں کے لیے ایک ہی سیڑھی بنائی گئی تھی۔ اس لئے اکثر اوقات حلوائی کی کتیا اپنے گھر جانے کے بجائے میرے کمرے میں چلی آتی تھی۔

اس عمارت کے تختوں کو آپس میں بہت ہی بھونڈے طریقے سے جوڑا گیا تھا۔ پیچ بہت کم استعمال کیے گئے تھے۔ شاید اس لئے کہ ان کو لکڑی میں داخل کرنے میں وقت صرف ہوتا ہے۔ کیلیں کچھ اس بیسے ربطی سے ٹھونکی گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا اس مکان کو بنانے والا بالکل اناڑی تھا کیلوں کے درمیان فاصلہ کی یکسانی کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا تھا۔ جہاں ہاتھ ٹھہر گیا وہیں پر کیل ایک ہی ضرب میں چپت کر دی گئی تھی۔ یہ بھی نہ دیکھا گیا کہ لکڑی پھٹ رہی ہے۔ یا کیل ہی بالکل ٹیڑھی ہو گئی ہے۔

چھت ٹین سے پاٹی ہوئی تھی جس کی قینچی میں چڑیوں کے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ کمرے کے باقی تختوں کی طرح چھت کی کڑیاں بھی رنگ و روغن سے بے نیاز تھیں۔ البتہ ان پر کہیں کہیں چڑیوں کی سفید بیٹھیں سفیدی کے چھینٹوں کے مانند نظر آتی تھیں۔ میرے کمرے میں تین کھڑکیاں چھوٹی تھیں۔ درمیانی کھڑکی طول و عرض میں دروازے کے برابر تھی۔ باقی دو کھڑکیاں چھوٹی تھیں ان کے کواڑوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ مالک مکان کا کبھی ارادہ تھا کہ ان میں شیشے جڑائے پر اب ان کے بجائے ٹین کے ٹکڑے اور لکڑی کے موٹے موٹے ناہموار ٹکڑے جڑے تھے کہیں کہیں لندن ٹائمز اور ٹریبیون اخبار کے ٹکڑے بھی لگے ہوئے تھے جن کا رنگ دھوپ اور بارش کی وجہ سے خستہ بسکٹوں کی طرح بھوسلا ہو گیا تھا۔ یہ کھڑکیاں جن کی کنڈیاں ٹوٹی

ہوئی تھیں۔ بانہال کی طرف کھلتی تھیں اور ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اس لئے کہ ان کو بند کرنے کے لئے کافی وقت اور محنت کی ضرورت تھی کھڑکیوں میں سے دور نظر ڈالنے پر پہاڑیوں کے بیچوں بیچ ٹیڑھی جنگی مانگ کی طرح "کشتواڑ" اور بھدرواہ جانے والی سڑک بل کھاتی ہوئی چلی گئی اور آخر میں آسمان کی نیلاہٹ میں گھل مل گئی تھی۔

کمرے کا فرش خالص مٹی کا تھا جو کپڑوں جھٹ جاتی تھی اور دھوبی کی کوششوں کے باوجود اپنا گیروا رنگ نہ چھوڑتی تھی۔ فرش پہ پان کی پیک کے داغ جا بجا بکھرے ہوتے تھے۔ کہیں کہیں کونوں میں چچوڑی ہوئی ہڈیاں بھی پڑی رہتی تھیں۔ جو ہر روز جھاڑو سے کسی نہ کسی طرح بچاؤ حاصل کر لیتی تھیں۔

اس کمرے کے ایک کونے میں میری چارپائی بچھی تھی جو بیک وقت میز، کرسی اور بستر کا کام دیتی تھی۔ اس کے ساتھ والی دیوار پہ چند کیلیں ٹھکی ہوئی تھیں۔ ان پر میں تے کپڑے وغیرہ لٹکا دیتے تھے۔ دن میں پانچ چھ مرتبہ ان کو لٹکانا رہتا تھا۔ اس لئے کہ ہوا کی تیزی سے یہ اکثر گرتے رہتے تھے۔

کشمیر جانے یا وہاں سے آنے والے کئی مسافر اس کمرے میں ٹھہرے ہوں گے بعض نے آتے جاتے وقت تختوں پہ چاک کی ڈلی یا پنسل سے کچھ

نشانی کے طور پر لکھ دیا تھا۔ سامنے کھڑکی کے ساتھ والے تختے پر کسی صاحب نے یادداشت کے طور پر پنسل سے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی ۴/۵/۲۵ سے دودھ شروع کیا اور روپیہ پیشگی دیا گیا۔

اس طرح ایک اور تختے پر یہ مندرج تھا۔

دھوبی کو کل پندرہ کپڑے دیئے گئے تھے جن میں سے وہ دو کم لایا۔

میرے سرہانے کے قریب ایک تختے پر یہ شعر لکھا تھا۔

در و دیوار پہ یہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اس کے نیچے "علیم ہیٹر" لکھا تھا ظاہر ہے کہ یہ نویسندہ کا نام ہوگا۔ یہی شعر کمرے کے ایک اور تختے پر لکھا تھا۔ مگر زرد چاک سے اس کے اوپر تاریخ بھی لکھ دی گئی تھی ایک اور تختے پر یہ شعر مرقوم تھا ؎

میرے گھر آئے عنایت آپ نے مجھ پہ یہ کی
میرے سر آنکھوں پہ آؤ تھی یہ کب قسمت مری

اس سے دور ایک کونے میں یہ مصرعہ لکھا تھا۔

ایک ہی شب گو رہے۔ لیکن گلوں میں ہم رہے

اس مصرعے کے پاس ہی اسی خط میں پنجابی کے یہ شعر مرقوم تھے ؎

تیرے باہجہ نہ اسی قرار دل نوں، جذبہ پریم والا بے پناہ رہے گا

لکھا کیہاں تو ہو سیں دور باتو آپر سلاں نوں دلاں ندا راہ رہے گا
تیرے میرے پیار دا رب جانے، مگو نالے دا نیر گواہ رہے گا

ترجمہ: تیرے بغیر میرے دل کو کبھی قرار نہیں آئے گا۔ جذبۂ محبت بے پناہ رہے تو لاکھ میری آنکھوں سے دور ہو۔ لیکن دل کو دل کی راہ رہے گی۔ تیرے اور میرے پریم کو صرف خدا جانتا ہے۔ لیکن "مگو نالہ" کا پانی بھی اس کا گواہ رہے گا۔

میں نے ان اشعار کو غور سے پڑھا لیکن ایک بار نہیں کئی بار پڑھا۔ نہ معلوم ان میں کیا جاذبیت تھی۔ کہ پڑھتے پڑھتے میں نے "ہیر" کی دلنواز دھن میں انہیں گانا شروع کر دیا۔ لفظوں کا روکھا پن یوں بالکل دور ہو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ لفظ پگھل کر اس دھن میں حل ہو گئے ہیں۔

یہ شعر کسی خاص واقعہ کے تاثرات تھے۔ مگو نالہ ہوٹل کے ایک میل کے فاصلہ پر شہتوتوں اور اخروٹ کے درختوں کے نیچوں نیچ بہتا تھا۔ میں یہاں کئی بار ہو آیا تھا۔ اس کے ٹھنڈے پانی میں غوطے لگا چکا تھا۔ اس کے ننھے ننھے پتھروں سے گھنٹوں کھیل چکا تھا لیکن یہ بانو کون تھی۔؟

یہ بانو جس کا نام کشمیر کے ہر گوشے کی یاد تازہ کرتا تھا۔

میں نے اس بانو کو اس پہاڑی گاؤں میں ہر جگہ تلاش کیا مگر ناکام رہا۔ اگر شاعر نے اس کی کوئی نشانی بتا دی ہوتی تو بہت ممکن ہے۔ مگو نالے ہی کے

پاس اس کی اور میری مٹھ بھیڑ ہو جاتی۔ اس نگو نالے کے پاس جس کا پانی میرے بدن میں جھرجھری پیدا پیدا کر دیتا تھا۔

میں نے ہر جگہ بانو کو ڈھونڈا۔ اگر وہ نہ ملی۔ اس موہوم جستجو میں اکثر اوقات مجھے اپنی بیوقوفی پر بہت ہنسی آئی۔ کیونکہ بہت ممکن تھا کہ وہ اشعار سرے ہی سے مہمل ہوں اور کسی نوجوان شاعر نے اپنا من پرچانے کے لئے گھڑ دیئے ہوں مگر خدا معلوم کیوں مجھے اس بات کا دلی یقین تھا کہ بانو —— وہ بانو جو آنکھوں سے دور ہونے پر بھی اس شاعر کے دل میں موجود ہے۔ ضرور اس پہاڑی گاؤں میں سانس لے رہی ہے۔ سچ پوچھئے تو میرا یقین اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ بعض اوقات مجھے فضا میں اس کا تنفس گھلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

نگو نالے کے پتھروں پر بیٹھ کر میں نے اس کا انتظار کیا کہ شاید وہ ادھر آ نکلے اور میں اسے پہچان جاؤں لیکن وہ نہ آئی۔ کئی لڑکیاں خوبصورت اور بدصورت میری نظروں سے گذریں مگر مجھے بانو جیسی دکھائی نہ دی۔ نگو نالے کے ساتھ ساتھ اُگے ہوئے ناشپاتی کے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں اخروٹ کے گھنے درختوں میں پرندوں کی نغمہ ریزیاں اور گیلی زمین پر سبز اور ریشمیں گھاس میرے دل و دماغ پر ایک خوشگوار تکان پیدا کر دیتی تھی اور میں بانو کے حسین تصور میں کھو جاتا تھا۔

ایک روز شام کو منگورا سے کے ایک چوڑے چکلے پتھر پہ لیٹا تھا خنک ہوا جنگلی بوٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو میں بسی ہوئی چل رہی تھی فضا کا ہر ذرہ ایک عظیم الشان اور ناقابل بیان محبت میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آسمان پر اُڑتی ہوئی ابابیلیں زمین پر رہنے والوں کو گویا یہ پیغام دے رہی تھیں اٹھو تم بھی ان بلندیوں میں پرواز کرو۔

میں نیچر کی سحر کاریوں کا لیٹے لیٹے تماشا کر رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے خشک ٹہنیوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے ہی مڑکر دیکھا۔ جھاڑیوں کے پیچھے کوئی بیٹھا خشک ٹہنیاں توڑ رہا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور میلیپر پہن کر اس طرف روانہ ہو گیا کہ دیکھوں کون ہے۔

ایک لڑکی تھی جو خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا بنا کر باندھ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ بھدی اور کن سری آواز میں ماہیا گا رہی تھی۔ میرے جی میں آئی کہ آگے بڑھوں اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہوں کہ خدا کے لیے ان ٹوٹی لکڑیوں کا گٹھا اٹھاؤ اور جاؤ تجھے اذیت پہنچ رہی ہے۔" لیکن مجھے یہ کرنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ کیونکہ اس نے خود بخود گانا بند کر دیا۔

گٹھا اٹھانے کی خاطر جب وہ مڑی تو میں نے اسے دیکھا اور پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو بھٹیار خانے کے لئے ہر روز شام کو ایندھن لایا کرتی تھی۔ معمولی شکل و صورت تھی۔ ہاتھ پاؤں بے حد غلیظ تھے۔ سر کے بالوں میں

بھی کافی میل جم رہا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور دیکھ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ میں جب اُٹھ کر دیکھنے آیا تھا تو دل میں آئی کہ چلو اس سے کچھ باتیں ہی کر لیں۔۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ یہ ایندھن جو تم نے اکٹھا کیا ہے؛ اس کا تمہیں جما کیا دے گا۔"

جما اس بھٹیار خانے کے مالک کا نام تھا۔

اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا "ایک آنہ"

"صرف ایک آنہ"

کبھی کبھی پانچ پیسے بھی دے دیتا ہے۔

"تو سارا دن محنت کر کے تم ایک آنہ یا پانچ پیسے کماتی ہو"۔

اُس نے گٹھے کی تنتنک لکڑیوں کو درست کرتے ہوئے کہا "نہیں دن میں ایسے دو گٹھے تیار ہو جاتے ہیں"۔

"تو دو آنے ہو گئے"۔

"ہاں ہیں"۔

"تمہاری عمر کیا ہے۔؟"

اس نے اپنی چھوٹی موٹی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا "تم وہی بونا جو بھٹیار خانے کے اوپر رہتے ہو۔؟"

میں نے جواب دیا۔ ہاں وہی ہوں۔ تم مجھے کئی بار وہاں دیکھ چکی ہو۔"

"یہ تم نے کیسے جانا؟"

"اس لئے کہ میں نے تمہیں کئی بار دیکھا ہے۔"

"دیکھا ہوگا۔"

یہ کہہ کر وہ زمین پہ بیٹھ کر گٹھا اٹھانے لگی۔ میں آگے بڑھا۔ ٹھہرو میں اٹھوا دیتا ہوں۔ گٹھا اٹھواتے ہوئے لکڑی کا ایک نوکیلا ٹکڑا اس زور سے میری انگلی میں چبھا کہ میں نے دونوں ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ سر پہ رسی کو اٹھا کر گٹھے کو قریب قریب اٹھا چکی تھی۔ میرے ہاتھ ہٹانے سے اس کا توازن قائم رہا۔ اور وہ لڑکھڑائی۔ میں نے فوراً اسے تھام لیا۔ ایسا کرتے ہوئے میرا ہاتھ اس کی کمر سے لے کر اٹھے ہوئے بازو کی بغل تک گھسیٹتا ہوا چلا گیا۔ وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ سر پہ رسی کو اچھی طرح جمانے کے بعد اس نے میری طرف کچھ عجیب نظروں سے دیکھا اور چلی گئی۔

میری انگلی سے خون جاری تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر اس پہ باندھا۔ اور نگو نالے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس پتھر پہ بیٹھ کر میں نے اپنی زخمی انگلی کو پانی سے دھو کر صاف کیا۔ اور اس پہ رومال باندھ کر سوچنے لگا۔ یہ بھی اچھی رہی بیٹھے بٹھائے اپنی انگلی لہولہان کر لی — خود ہی اٹھا لیتی۔ میں نے بھلا یہ تکلف کیوں کیا۔

یہاں سے میں اپنے ہوٹل ، معاف کیجئے گا۔ بھٹیار خانے پہنچا اور کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دیر تک کھانا ہضم کرنے کی غرض سے کمرے میں میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ پھر کچھ دیر تک لالٹین کی اندھی روشنی میں ایک واہیات کتاب پڑھتا رہا۔ سچ پوچھئے تو اِردگرد ہر شے واہیات تھی۔ لال مٹی جو کپڑے کے ساتھ ایک دفعہ لگ گئی تھی تو دھوبی کے پاس جا کر بھی الگ نہ ہوتی تھی اور وہ آپس میں نہایت ہی بھونڈے طریقے سے جوڑے ہوئے تختے اور ان پر لکھے ہوئے غلط اشعار اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں جو ہر روز جھاڑو کی زد سے کسی نہ کسی طرح بچ کر میری چارپائی کے پاس نظر آتی تھیں۔

کتاب ایک طرف رکھ کر میں نے لالٹین کی طرف دیکھا مجھے اس میں اور اس لکڑیاں چننے والی میں ایک گونہ مماثلت نظر آئی۔ کیونکہ لالٹین کی چمنی کی طرح اس لڑکی کا لباس بے حد غلیظ تھا مجھے اس کو بجھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ کیونکہ میں نے سوچا تھوڑی سی ہی دیر دھوئیں کی وجہ سے یہ اس قدر اندھی ہو جائے گی کہ خود بخود اندھیرا ہو جائے گا۔

کھڑکیاں خود بخود بند ہو گئی تھیں۔ میں نے ان کو بھی نہ کھولا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ رات کے نو یا دس بج چکے تھے سونے ہی والا تھا کہ بازار میں ایک کتا زور سے بھونکا جیسے اس کی پسلی میں یکایک درد اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اس پر لعنتیں بھیجیں اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ مگر فوراً

ہی نزدیک و دور سے کئی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک عجیب و غریب سنگیت قائم ہو گیا۔ اگر کوئی کتا ایک سر چھیڑتا سنگیت کے سارے سر فضا میں گونجنے لگے۔ میری نیند حرام ہو گئی۔

دیر تک میں نے صبر کیا۔ لیکن مجھ سے نہ رہا گیا تو اٹھا دوسرے کمرے میں گیا اور اس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نیچے بازار میں اتنا لوہا جو پتھر میرے ہاتھ میں آیا مارنا شروع کر دیا۔ ایک دو پتھر کتوں کے لگے۔ کیونکہ نہایت ہی مکروہ آوازیں بلند ہوئیں۔ میں نے اس کامیابی پر اور زیادہ پتھر پھینکنے شروع کئے۔ دفعتاً کسی انسان کے "اُف" کرنے کی آواز سنائی دی۔ میرا ہاتھ دہیں پتھر ہو گیا۔

آواز کسی عورت کی تھی۔ سڑک کے دائیں ہاتھ ڈھلوان تھی ادھر تیز قدمی سے گیا۔ تو میں نے دیکھا کہ نیچے ایک لڑکی دوہری ہو کر کراہ رہی تھی میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ کھڑی ہو گئی۔ بدلی کے پیچھے چھپے ہوئے چاندنی کی دھندلی روشنی میں مجھے اپنے سامنے وہی ایندھن چننے والی لڑکی نظر آئی۔ اس کے ماتھے سے خون نکل رہا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ کہ میری غفلت کے باعث اُسے اتنی تکلیف ہوئی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا "مجھے معاف کر دینا۔ . . . لیکن تم یہاں کیا کر رہی تھیں ؟

"اس نے جواب دیا میں اوپر چڑھ رہی تھی۔"

"رات کو اس وقت تمہیں کیا کام تھا۔"

اس نے کرتے کی آستین سے ماتھے کا خون صاف کیا اور کہا "اپنے کتے شیرو کو ڈھونڈ رہی تھی"

بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی" اور میں تمام کتوں کا خون کر دینے کا تہیہ کر کے گھر سے نکلا تھا۔

وہ بھی ہنس دی۔

"کہاں ہے تمہارا شیرو ؟"

اللہ جانے کہاں گیا ہے "یوں ہی سارا دن مارا مارا پھرتا ہے۔"

"تو اب کیسے تلاش کرو گی ؟"

"یہیں سڑک پہ مل جائے گا کہیں"۔

"میں بھی تمہارے ساتھ اسے تلاش کر دوں ؟"

نیند میری آنکھوں سے بالکل اڑ چکی تھی۔ اس لئے میں نے کہا کہ چلو کچھ دیر شغل رہے گا۔ لیکن اس نے سر ہلا کر کہا۔ نہیں میں اسے آپ ہی ڈھونڈ لوں گی۔ مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہو گا۔

"ابھی ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں"۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارے مکان کے پچھواڑے ہو گا"

"تو چلو مجھے بھی ادھر جانا ہے۔ کیونکہ میں پچھلا دروازہ کھول کر باہر

نکلا تھا۔"

ہم دونوں بھٹیار خانے کے پچھواڑے کی جانب روانہ ہوئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جو کبھی کبھی بدن پر خوشگوار اور کپکپی طاری کر دیتی تھی۔ چاند ابھی تک بادل کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ روشنی تھی مگر بہت ہی دھندلی، جو رات کی خنکی میں بڑی پُراسرار معلوم ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ آدمی کمبل اوڑھ کے لیٹ جائے اور اوٹ پٹانگ باتیں سوچے۔

سڑک طے کر کے ہم اوپر چڑھے اور بھٹیار خانے کے عقب میں پہنچ گئے۔ وہ میرے آگے تھی۔ ایک دم وہ ٹھٹکی اور منہ پھیر کر عجیب و غریب لہجے میں اس نے کہا۔ "دور دفاں ہو ہونا مراد؟"

ایک موٹا تازہ کتا نمودار ہوا اور اپنے ساتھ حلوائی کی کتیا کو گھسیٹتا ہوا ہمارے پاس سے گذر گیا۔

دروازہ کھلا تھا میں اسے اندر اپنے کمرے میں لے گیا۔ لالٹین کی چمنی ابھی مکمل طور پر سیاہ نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ ایک کونے سے جو اس کا لک سے بچ گیا تھا۔ تھوڑی تھوڑی روشنی باہر نکل رہی تھی۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد ہم باہر نکلے۔ چاند اب بادل سے نکل آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نیچے سڑک پر اس کا کتا شیر و بڑے سے پتھر کے پاس بیٹھا اپنا بدن صاف کر رہا تھا۔ اس سے کچھ دور حلوائی کی کتیا کھڑی تھی۔

جب وہ جانے لگی تو میں نے اس سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔

"بانو"۔

"بانو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

اب اس نے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے"۔

میں نے جواب دیا "شیرو"۔

قانون کی حفاظت

افراد

سالک رام .... وکیل   سروپ ...... مؤکل

چمپا ...... وکیل کی لڑکی   ساوتری .... وکیل کی بیوی

اور منشی

پہلا منظر

ایک بڑا کمرہ جیسا کہ عام طور پر کامیاب وکیلوں اور بیرسٹروں کا ہوتا ہے اس کے وسط میں ایک بڑا میز تھا۔ جس پر بے شمار کاغذات پڑے ہیں کچھ پلندوں کی صورت میں کچھ بکھرے ہوئے اور کچھ ٹریز میں سامنے ایک میں بھاری بھرکم کتابیں رکھی ہیں۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ

بڑی بڑی الماریاں ہیں۔ جو قانونی کتابوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اس میز کے ساتھ گھومنے والی کرسی پر وکیل صاحب بیٹھے ہیں۔ ان کے ایک طرف فرش پر ان کا منشی چشمہ چڑھائے ڈیسک کے پاس بیٹھا ہے اور کاغذات دیکھنے میں مصروف ہے۔ وکیل صاحب کے سامنے ان کا موکل بیٹھا ہے جو اپنی گفتگو ختم کر چکا ہے۔ اور جانے کے قریب ہے۔

وکیل:۔ منشی جی ان کے مقدمے کی تاریخ وغیرہ نوٹ کر لو۔ اور دیکھو کل مجھے یاد سے یہ کاغذات دے دینا تاکہ میں ان کا مطالعہ کر لوں ۔۔۔ آج تاریخ کیا ہے؟

منشی:۔ آٹھ۔

وکیل:۔ مہینہ؟

منشی:۔ مارچ!

وکیل:۔ سن؟

منشی:۔ چالیس!

وکیل (موکل سے) معاف کیجئے گا۔ میرا حافظہ بہت کمزور ہے۔ کثرت کار کے باعث مجھے بہت سی باتیں بھول جاتی ہیں۔ کیا کہا تھا۔ منشی جی سن کیا ہے؟ چالیس۔ آٹھ مارچ سن چالیس ۔۔۔ یہ لیجئے رسید (موکل رسید

لیتا ہے) آپ کا اسم گرامی، نہیں ـــــ نہیں ـــــ نہیں ـــــ یہاں لکھا تو
ہے ـــــ ہاں مسٹر نرائن اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ پر ماتما نے چاہا
تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

نرائن:۔ (اٹھ کر) اچھا نمسکار وکیل صاحب۔

وکیل:۔ نمسکار!

(نرائن چلا جاتا ہے۔ وکیل میز پر کتابوں کو الٹ پلٹ کرتا ہے۔)

وکیل:۔ (ایک کتاب ٹرے سے اٹھاتے ہوئے) ہاں منشی جی اب کیا ہے ؟)

منشی:۔ ایک اور موکل باقی رہ گیا ہے۔ نوجوان چھوکرا ہے۔ کہتا ہے کہ آپ سے
کوئی قانونی مشورہ کرنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی ایسی ویسی بات کر بیٹھا ہے۔

(فرش پر سے اٹھتا ہے اور دروازے کی جانب چلتا ہے۔)

وکیل:۔ یہاں جو بھی آتا ہے ایسی ویسی بات ہی کر کے آتا ہے۔ بھیجدو اسے
اندر۔ (منشی باہر جا کر ایک نوجوان آدمی کو ساتھ لاتا ہے۔

سروپ:۔ گڈ مارننگ۔

وکیل گڈ مارننگ

(منشی اپنی جگہ بیٹھ جاتا ہے)

سروپ:۔ (کرسی پر بیٹھ کر) میں نے اپنے دوست سے آپ کی بہت تعریف
سنی ہے۔ ویسے اخباروں میں بھی آپ کا نام پڑھتا رہا ہوں۔ مجھے دراصل آپ

سے ایک قانونی مشورہ لینا ہے۔
وکیل:۔ بڑے شوق سے۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میری فیس بہت زیادہ ہے۔
سروپ:۔ کچھ بھی زیادہ نہیں ۔۔ مگر میں دگنی فیس دینے کے لئے تیار ہوں اگر آپ مجھے کوئی ایسا راستہ بتائیں ۔۔ مگر ٹھہریئے۔ پہلے آپ یہ بتلایئے کیا اچھا قانون دان قانون توڑ سکتا ہے؟
وکیل:۔ کیوں نہیں قانون بنائے ہی اس لئے گئے ہیں کہ توڑے جائیں۔ اچھا قانون دان جب چاہے قانون کو توڑ مروڑ سکتا ہے۔
سروپ:۔ تو عرض کروں، میں کیا چاہتا ہوں؟
وکیل:۔ فرمایئے۔
سروپ:۔ میرا نام رام سروپ ہے ۔۔ میں بی اے میں پڑھتا ہوں۔ ایک لڑکی سے مجھے پریم ہو گیا ہے۔ جس کا نام ۔۔ میں بتا دوں تو کوئی ہرج تو نہیں ہوگا ۔۔ یعنی وہ آپ ہی تک رہے نا؟
وکیل:۔ صاحبزادے! یہاں کوئیں کے کوئیں خالی کر دیئے مگر آپ خشک رہے کہو جو کچھ تمہیں کہنا ہے بے خوف کے کہو۔ ڈاکٹروں اور وکیلوں کو سب ممبار بتانے پڑتے ہیں۔
سروپ:۔ ہاں تو وکیل صاحب بات یہ ہے کہ مجھے ایک سے جس کا نام

چمپا ہے بے حد محبت ہو گئی ہے۔ اس کو بھی مجھ سے پریم ہے۔

وکیل:۔ تو مشکل کیا ہے ـــ کیا کہا ـــ لڑکی کا نام کیا ہے ؟

سروپ:۔ چمپا !

وکیل:۔ ہوں ـــ تو اب مشکل کیا آن پڑی ہے ـــ تم کو ـــ ؟

سروپ:۔ جی نہیں۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس کے والدین راضی نہیں ہوں گے۔ اس لئے کہ اس کی بات کہیں اور پکی کر دی گئی ہے۔ میں اب یہ چاہتا ہوں کہ اس کو اغوا کر کے لے جاؤں اور کسی دوسرے شہر میں اس سے باقاعدہ شادی کر لوں ـــ آپ کا کیا خیال ہے ؟

وکیل:۔ اس کو اغوا کر کے لے جاؤ۔ جانتے ہو اس جرم کی سزا کتنی زبردست ہے ـــ ؟

سروپ:۔ مجھے معلوم ہے مگر لڑکی کی رضا مندی ہے۔ یعنی جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ جب اس کو میری دھرم پتنی بننا منظور تو سزا اور جرم کا سوال ہی کہاں باقی رہتا ہے۔

وکیل:۔ اغوا کے بعد اگر لڑکی پر اس کے ماں باپ نے زور ڈالا اور اسے مجبور کیا کہ وہ تمہارے خلاف بیان دے تو سزا اور جرم کا سوال پیدا ہو سکتا ہے ایسے معاملوں میں وثوق سے کچھ نہیں کہنا چاہیئے۔ کیونکہ لڑکیاں عام طور

پھر والدین کے دباؤ میں آجایا کرتی ہیں۔

سروپ:۔ بس بس آپ نے میرا مطلب سمجھ لیا۔ اسی غرض سے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ کوئی ایسی ترکیب بتلایئے کہ ان جھگڑوں کا خوف ہی نہ رہے۔ یعنی کسی بات کا ڈر نہ ہو اور میں اپنا کام بڑے آرام سے کر دوں۔

وکیل:۔ تم اس اغوا میں مجھ سے مدد لینا چاہتے ہو۔

سروپ:۔ بالکل نہیں۔ میں صرف قانونی حفاظت چاہتا ہوں۔ اول تو یہ اغوا غیر قانونی نہیں ہے۔ اس لئے کہ چمپا میرے ساتھ بھاگنے کو بالکل تیار ہے۔ دوسرے ہم ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی کا ایک آدھ رومانس تو ہو۔ وکیل صاحب آپ نے دنیا دیکھی ہے آپ کو اس بات کا ضرور احساس ہوگا کہ ایسے واقعات بڑھاپے میں بڑا مزا دیا کرتے ہیں۔ تو غرض یہ ہے کہ کوئی ایسا گر بتایئے جس سے بے کھٹکے اپنا کام کر جاؤں۔ بس لطف آجائے۔

وکیل:۔ میں سمجھ گیا۔ دیکھو اس کے لئے تمہیں تین چار چیزوں کی ضرورت ہے۔ لڑکی کا نام کیا ہے۔؟

سروپ:۔ چمپا!

وکیل:۔ ہاں تو چمپا سے تم اغوا کے ایک روز پہلے ایک خط حاصل کر لو جس میں

وہ تم سے شادی کی درخواست کرے۔ بس لکھا ہو کہ وہ گھر والوں سے بالکل تنگ آگئی ہے۔ اس لئے وہ تم سے شادی کرنے کا عہد کر چکی ہے۔ چنانچہ اس غرض سے وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر تمہارے پاس آرہی ہے۔ کیا وہ ایسا خط لکھ دے گی؟

سروپ :۔ کیوں نہیں میں اس سے فوراً لکھوا لوں گا۔

وکیل :۔ یہ تو ایک چیز ہوئی جو کہ بہت ضروری سی تھی۔ اب اگر لڑکی کے ماں باپ نے یہ کہا کہ وہ بہت سارا پیسہ نقد اور ہزاروں روپے کا زیور بھی ساتھ لے گئی ہے جو اس نے تمہاری تحویل میں دے دیا ہے۔ تو اس کا جواب کیا دیا جائے گا۔؟ ظاہر ہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہوگا۔ مگر تمہیں تو پریشان کیا جا سکتا ہے اس لئے اس کا بھی پہلے ہی سوچا ہوگا۔

سروپ :۔ جی ہاں! — کیوں نہیں؟

(وکیل اٹھ کر کمرے میں ٹہلتا ہے)

وکیل :۔ (کچھ سوچ کر) اغوا رات کو کرو گے یا دن کو؟

سروپ :۔ دن کو۔ اس لئے کہ رات کو ۹ بجے کے بعد میں بالکل جاگ نہیں سکتا — !

وکیل :۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ اچھا تو وہ لڑکی اپنے ساتھ زیور وغیرہ تو نہیں — لائے گی۔؟

ملزوپ: جی نہیں!

وکیل:۔ (ٹہلتے ہوئے) تو ایسا کرو کہ اغوا کے فوراً بعد تم اپنے کسی دوست کو اس علاقے کی پولیس چوکی میں جہاں اس لڑکی کا مکان ہو بھیجدو۔ وہ تھانے میں یہ جھوٹی رپورٹ لکھوائے کہ چمپا کے گھر میں زبردست چوری ہو گئی ہے اگر ہو سکے تو وہ تھانے دار کو اس مکان تک بھی لے جائے۔ اور آپ بھاگ جائے۔

ملزوپ:۔ اس سے کیا ہوگا۔؟

وکیل:۔ پولیس وہاں جائے گی اور اسے یہ معلوم ہوگا کہ چوری کی اطلاع غلط تھی۔ گھر والے اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے۔ اور رجسٹر میں یہ لکھا جائے گا کہ فلاں آدمی کے گھر میں چوری ہونے کی جو اطلاع ملی تھی۔ غلط ہے تاریخ اور وقت وغیرہ سب رپورٹ میں درج ہوگا۔ جو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ چمپا اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لائی۔

ملزوپ:۔ (خوشی سے اچھل کر) وہ مارا ـــــ کیا کہنے ہیں آپ کے وکیل صاحب ـــــ کیا نکتہ پیدا کیا۔

وکیل:۔ (کرسی پہ بیٹھ کر) تم لڑکی کو کالج ہی سے بھگا کر لے جانے کا ارادہ رکھتے ہو نا؟

ملزوپ: جی ہاں! ـــــ لیکن اگر آپ چاہیں ـــــ یعنی یہ کوئی ضروری نہیں

کہ اسے کالج ہی سے اغوا کیا جائے۔آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی کروں گا۔

وکیل :۔نہیں نہیں کالج ہی سے اچھا ہے۔تو ایک بات کرنا کہ کالج سے نکل کر تم دونوں کسی فوٹو گرافر کے پاس چلے جانا اور اپنا فوٹو کھچوا لینا۔

سروپ :۔یہ فوٹو رکھ لیا جائے۔

وکیل :۔نہیں۔اس کی ضرورت نہیں۔فوٹو گرافر کے پاس وہ بالکل محفوظ رہے گا اگر ضرورت پڑی تو فوٹو منگا لیا جائے گا۔

سروپ :۔اس کی کیا ضرورت ہوگی۔

وکیل :۔صاحبزادے! اس سے یہ ثابت ہوگا کہ اس لڑکی کے پاس چند زیور تھے۔جو اس نے پہن رکھے تھے۔اور اس بات کا ضرور خیال رہے کہ لڑکی اپنی ماں کو یا باپ کو کسی ذریعہ سے مطلع کر دے کہ وہ اب گھر نہیں آئے گی۔اس لئے کہ وہ تمہارے ساتھ جا رہی ہے۔اور دیکھو اگر تم شادی کے دعوتی رقعے چھپوا کر اپنے دوستوں میں تقسیم کر دو تو بڑا مزا رہے گا۔شادی تم اغوا ہی کے روز کرو گے نا؟

سروپ :۔جی ہاں۔

وکیل :۔(اٹھ کھڑا ہوتا ہے) تو ابھی جا کر رقعے چھپوا لو اور اپنے ان دوستوں اور رشتہ داروں کے نام پوسٹ کر دو۔جو دوسرے شہروں میں رہتے ہوں۔شادی کا انتظام وغیرہ تو ہو چکا ہے نا؟

سروپ:۔ (اُٹھ کر) جی ہاں سب انتظام مکمل ہے۔
وکیل:۔ تو جاؤ بے کھٹکے اپنا کام کرو۔ قانون تمہاری حفاظت کرے گا۔
سروپ:۔ شکریہ وکیل صاحب۔ بہت بہت شکریہ۔ اب تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں لوہے کے جنگلے کے پیچھے کھڑا ہوں۔ کوئی ہاتھ مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ رہی آپ کی فیس۔ میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں۔
(تین نوٹ دس دس کے بٹوے سے نکال کر وکیل کو دیتا ہے۔ وکیل مسکرا کر یہ نوٹ پکڑتا ہے اور میز پہ ایک بلوریں پیپر ویٹ کے نیچے رکھ دیتا ہے
سروپ:۔ اچھا! نمسکار وکیل صاحب
وکیل:۔ (مسکراتے ہوئے) نمسکار

(سروپ چلا جاتا ہے)
وکیل:۔ (منشی صاحب سے مخاطب ہو کر) لوگ سمجھتے ہیں کہ افتاد آ پڑنے کے بعد ہی وکیلوں سے مشورہ لینا چاہیئے۔ یہ غلط ہے۔ افتاد سے پہلے وکیل زیادہ فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں اگر غلطی کرنے سے پہلے وکیل کی رائے طلب کر لی جائے تو جیل خانے اتنے آباد نہ ہوں۔ اور نہ کچہریوں میں اتنی رونق ہو۔ وکیل کے پیشے کا صحیح مطلب آج اس چھوکرے نے سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب بالکل محفوظ ہے۔
منشی:۔ جی ہاں! اس میں کیا شک ہے۔

وکیل :- (مسکراتا ہے اور پیپر ویٹ کے نیچے سے نوٹ نکال کر جیب میں رکھ لیتا ہے) بڑا مخاط لڑکا تھا۔

دوسرا منظر

سالک رام وکیل کا گھر ——— ڈرائنگ روم ——— وکیل کی بیوی ایک صوفے پر بیٹھی اونی بنیان بن رہی ہے۔ سامنے دیوار پر ایک خوبصورت لڑکی کے فوٹو کا انلارجمنٹ خوبصورت فریم میں لٹکتا دکھائی دیتا ہے۔ پردہ اٹھتا ہے تو چند لمحات کے توقف کے بعد سالک رام وکیل ہاتھ میں ایک کارڈ لیے ہنستا ہنستا اندر داخل ہوتا ہے۔

وکیل کی بیوی :- (بنتے بنتے اپنے شوہر کی طرف دیکھتی ہے) یہ آج اتنی ہنسی کیوں آ رہی ہے؟ (وکیل جواب نہیں دیتا۔ ہیٹ اتار کر ایک طرف رکھتا ہے۔ لیکن اس دوران میں بھی اس کی ہنسی بند نہیں ہوتی)

وکیل کی بیوی :- ضرور تم نے وہ بات سن لی ہوگی؟

وکیل :- (ہنستے ہنستے) کونسی بات؟ میں تو شادی کا یہ کارڈ پڑھ کر ہنس رہا تھا۔ (ہنستا ہے) اس نے مجھے ایک کارڈ بھیج دیا۔ آج کل کے یہ لونڈے کتنے

پشتریہ ہوتے ہیں۔

وکیل کی بیوی: ہ جانے کیا کہہ رہے ہو۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہ آیا ادھ ہنسنے ہو۔ آج کیا تماشا ہوا۔ پولیس چوکی سے ایک آدمی آیا۔

وکیل :۔ (حیرت سے) پولیس کی چوکی سے ؟ کیوں ؟

بیوی:۔ یہ پوچھنے آیا تھا کہ ہمارے گھر میں کتنے کی چوری ہوئی ہے۔ ہمارا کیا چرایا گیا ہے۔؟

وکیل :۔ (جلدی جلدی) پوچھنا کہ ہمارے گھر میں کتنے کی چوری ہوئی ہے ۔۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ تم ۔۔۔ تم نے کہہ دیا کہ ہمارا کچھ بھی نہیں گیا ۔۔۔ تم نے اس سے کہہ دیا کہ ہماری کوئی چیز بھی نہیں چرائی گئی اور میرے بھگوان ۔۔۔ چمپا کہاں ہے ؟ ۔۔۔ ارے ہاں ۔۔۔ اس نے بھی تو چھپا ہی کہا تھا۔

بیوی :۔ چمپا چمپا کیا کہہ رہے ہو چمپا ہو گی کالج میں ۔۔۔ تو اور میں اس سے کیا جھوٹ بولتی۔ یہ کہتی کہ سب ہمارا سب گھر بار لٹ گیا ہے ۔ جانے کس کی چوری ہوئی اور وہ موا ہمارے پاس چلا آیا ۔۔۔ میں نے اس سے کہا" ہمارے یہاں چور آ کے کیا کریں گے۔ ہمارا روپیہ بنک میں زیور جو ہیں وہ بھی بنک میں ۔۔۔ وہ سو روپے جو تم گھر کے خرچ کے لئے دیئے گئے تھے۔ میز کے دراز میں حفاظت سے رکھے تھے۔

(وکیل کا سر چکراتا ہے۔ اور لڑکھڑا کر ایک پر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ اُٹھتی ہے) ہے ہے تمہارے دشمنوں کو کیا ہو گیا۔ چپا کے پتا ــــ چپا کے پتا۔

وکیل:۔ (بوکھلا کر) چپا گئی ــــ چپا گیا ــــ!

بیوی:۔ کہاں گئی ؟ ــــ بس ابھی آتی ہو گی ــــ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے دشمنوں کو تکلیف کیا ہے ؟ اے راما ــــ اے راما ــــ ایک گلاس ٹھنڈے پانی کا لا۔ بابو جی کے لئے ــــ بھاگ کے لا ــــ بھاگ کے۔ ــــ ہے ہے تمہارا رنگ تو ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا ہے (ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

بیوی:۔ (چونک کر اٹھا کر) ہلو ہلو ــــ ہلو ــــ میں بول رہی ہوں چپا کیا کہا؟ نہیں ـ نہیں تم نہیں جا سکتیں۔ تمہارے پتا جی بیمار ہیں۔

وکیل:۔ کون ہے ؟ ــــ کون ہے ؟ ــــ چپا ہے ؟ کیا کہتی ہے ؟

بیوی:۔ چپ بھی کرو۔ سننے بھی دو ــــ کیا کہا ــــ (تھوڑا وقفہ) ــــ تم شادی کرنے جا رہی ہو ــــ میرے بھگوان (چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔)

وکیل:۔ (بے ہوش بیوی کے پاس جا کر) ساوتری ــــ ساوتری ــــ کیا کہا ہے چپا نے ؟ ساوتری ــــ ساوتری بے ہوش ہو گئی ۔ راما، راما

ساوتری ـــــ یہاں ـــــ کوئی بھی تو نہیں ـــــ اُورا ما ـــــ

ساوتری ـــــ چمپا گئی ـــــ وہ لونڈا ہے گیا اُسے ـــــ اور ـــــ

میں نے ـــــ میں نے تیس روپے دے کر اُسے سارے ڈھنگ ـــــ

بتا دیئے۔

مجھے موت کیوں نہیں آتی ـــــ میں ـــــ اب کیا کروں ؟ ساوتری ـــــ

ساوتر ـــــ (اس کی بیوی بے ہوشی میں چمپا چمپا کہتی ہے) چمپا گئی اور

میں نے سارا قانون اس کے ہاتھ میں دے دیا ـــــ اب کچھ نہیں

ہو سکتا۔ میں کتنا بے وقوف ہوں۔ وہ چمپا چمپا کہتا رہا اور مجھے ذرا بھی

شک نہ ہوا۔ شادی کے رقعے پر اپنا نام بھی دیکھا اور میرے دماغ میں

یہ بات نہ آئی ـــــ اُورا ما ـــــ یہ کہاں مر گیا آج ـــــ ساوتری ـــــ

ساوتری ـــــ خط تو اس نے لکھوا لیا ہوگا۔ اس نے میرے کہے پر

حرف بحرف عمل کیا ہوگا۔ (اٹھتا ہے اور ٹیلیفون کرنے لگتا ہے) ٹیلیفون

کروں ؟ ـــــ پر کسے کروں ؟ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے) ـــــ یہ کون

ہے ـــــ یہ کون ہے ـــــ ہلو ـــــ ہلو ـــــ ہاں ـــــ ہاں ـــــ مس

چمپا سالک رام ـــــ کسی نے فوٹو ووٹو تو نہیں بھجوایا یہاں ہے ارے یہ

رکھ دینا ہے لیکن فوراً ہی کچھ یاد کر کے اسے اٹھا لینا ہے) ارے ہاں فوٹو ؟

چمپا اور اس کا فوٹو ـــــ یہ کون فوٹو گرافر تھا ؟ (غصے سے ریسیور پٹک

ہے اور بے ہوش بیوی کی طرف جاتا ہے۔) ساوتری ـــــ ساوتری
ـــــ پرماتما کے لیے ہوش میں آؤ۔ پرماتما کے لیے ہوش میں آؤ۔
اب میں بے ہوش ہونا چاہتا ہوں ـــــ ساوتری ـــــ ساوتری
بے ہوش ہو جاتا ہے)

پردہ

بلاؤز

کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا سارا وجود کچا پھوڑا بن گیا ہے کام کرتے ہوئے حتیٰ کے سوچنے پر بھی اُسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔

بعض اوقات بیٹھے بیٹھے وہ ایک دم چونک پڑتا۔ دھندلے دھندلے خیالات جو عام حالتوں میں بے آواز بلبلوں کی طرح پیدا ہو کر مٹ جایا کرتے ہیں۔ مومن کے دماغ میں بڑے شور کے ساتھ پیدا ہوتے تھے اور شور کے ساتھ پھٹتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے دل و دماغ کے نرم و نازک پردوں پر ہر وقت جیسے خاردار پاؤں والی چیونٹیاں سی رینگتی رہتی تھیں۔ عجیب قسم کا کھنچاؤ اس کے اعضا میں پیدا ہو گیا تھا جس کے باعث اسے

تکلیف ہوتی تھی۔ اس تکلیف کی شدت جب بڑھ جاتی تو اس کے جی میں آتا کہ اپنے آپ کو ایک بڑے سے ہاون میں ڈال دے اور کسی سے کہے "مجھے کوٹنا شروع کر دو۔"

باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ پیروں کو ذریعے سے یہ لرزش اس کی تنی ہوئی پنڈلیوں اور رانوں میں دوڑتی ہوئی اس کے دل تک پہنچ جاتی جو تیز ہوا میں رکھے ہوئے دیئے کی طرح کانپنا شروع کر دیتا۔

مومن کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ شاید سولہواں بھی لگا ہو۔ اسے اپنی عمر کے متعلق صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہ ایک صحت مند اور تندرست لڑکا تھا جس کا لڑکپن تیز قدمی سے جوانی کے میدان کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسی دوڑ نے جس سے مومن بالکل غافل تھا اس کے لہو کے ہر قطرے میں سنسنی پیدا کر دی وہ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر ناکام رہتا تھا۔

اس کے جسم میں کئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ گردن جو پہلے پتلی تھی۔ اب موٹی ہو گئی تھی۔ بانہوں کے پٹھوں میں اینٹھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ کنٹھ نکل رہا تھا۔ سینے پر گوشت کی تہہ موٹی ہو گئی تھی اور اب کچھ دنوں سے پستانوں میں گولیاں سی پڑ گئی تھیں۔ جگہ ابھر آئی تھی۔ جیسے کسی نے ایک بنٹا اندر

داخل کر دیا ہے۔ ان ابھاروں کو ہاتھ لگانے سے مومن کو بہت درد محسوس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کام کرنے کے دوران میں غیر ارادی طور پر جب اس کا ہاتھ ان گولیوں سے چھو جاتا تو وہ تڑپ اٹھتا۔ قمیص کے موٹے اور کھردرے کپڑے سے بھی اس کو تکلیف دہ سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی۔

غسل خانے میں نہاتے وقت یا باورچی خانے میں جب کوئی اور موجود نہ ہو مومن اپنی قمیص کے بٹن کھول کر ان گولیوں کو غور سے دیکھتا تھا ہاتھوں سے مسلتا تھا۔ درد ہوتا، ٹیسیں اٹھتیں۔ اس کا سارا جسم پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ کی طرح جسے زور سے ہلایا گیا ہو کانپ جاتا مگر اس کے باوجود وہ اس درد پیدا کرنے والے کھیل میں مشغول رہتا تھا۔ کبھی کبھی زیادہ دبانے پر یہ گولیاں پچک جاتیں اور ان کے منہ سے لیسدار لعاب نکل آتا۔ اس کو دیکھ کر اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سرخ ہو جاتا۔ وہ یہ سمجھتا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔

گناہ اور ثواب کے متعلق مومن کا علم بہت محدود تھا۔ ہر وہ فعل جو ایک انسان دوسرے انسانوں کے سامنے نہ کر سکتا ہو۔ اس کے خیال کے مطابق گناہ تھا۔ چنانچہ جب شرم کے مارے اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سرخ ہو جاتا تو وہ جھٹ سے اپنی قمیص بند کر لیتا کہ آئندہ ایسی فضول حرکت کبھی

نہیں کرے گا۔ لیکن اس عہد کے باوجود دوسرے تیسرے روز تخلئے میں پھر
اسی کھیل میں مشغول ہو جاتا۔

مومن سے گھر والے سب خوش تھے وہ بڑا محنتی لڑکا تھا۔ سب کام
وقت پر کر دیتا تھا اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے
یہاں اسے کام کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے لیکن اس قلیل
عرصے میں اس نے گھر کے ہر فرد کو اپنی محنت کش طبیعت سے متاثر کر لیا
تھا۔ چھ مہینے میں یہ وہ نوکر ہوا تھا ...... مگر دوسرے مہینے ہی اس
کی تنخواہ میں دو روپے بڑھا دیئے گئے تھے۔ وہ اس گھر میں بہت خوش
تھا اس لئے کہ اس کی یہاں قدر کی جاتی تھی۔ مگر وہ اب کچھ دنوں سے بیقرار
تھا۔ ایک عجیب قسم کی آوارگی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا
جی چاہتا تھا کہ سارا دن بے مطلب بازاروں میں گھومتا پھرے یا کسی
سنسان مقام پر جا کر لیٹا رہے۔

اب کام میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ لیکن اس بے دلی کے ہوتے ہوئے
بھی، وہ کاہلی نہیں برتتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گھر میں کوئی بھی اس کے
اندرونی انتشار سے واقف نہیں تھا۔ رضیہ تھی۔ سو وہ دن بھر باجہ بجاتے
نئی نئی فلمی طرزیں سیکھنے اور رسالے پڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ اس
نے کبھی مومن کی نگرانی ہی نہیں کی تھی شکیلہ البتہ مومن سے اِدھر اُدھر

کے کام لیتی تھی۔ اور کبھی اسے ڈانٹتی بھی تھی۔ مگر اب کچھ دنوں سے وہ چند بلاؤزوں کے نمونے اتارنے میں بہت مشغول تھی۔ یہ بلاؤز اس کی ایک سہیلی کے تھے۔ جسے نئی نئی تراشوں کے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا شکیلہ اس سے آٹھ بلاؤز مانگ کر لائی تھی اور کاغذوں پر ان کے نمونے اتار رہی تھی۔ چنانچہ اس نے بھی کچھ دنوں سے مومن کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

ڈپٹی صاحب کی بیوی سخت گیر عورت نہیں تھی۔ گھر میں دو نوکر تھے یعنی مومن کے علاوہ ایک بڑھیا بھی تھی۔ زیادہ تر باورخانے کا کام یہی کرتی تھی۔ مومن کبھی کبھی اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی نے ممکن ہے مومن کی مستعدی میں کوئی کمی دیکھی ہو۔ مگر اس نے مومن سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اور وہ انقلاب جس میں سے مومن کا دل و دماغ اور جسم گذر رہا تھا اس سے تو ڈپٹی صاحب کی بیوی بالکل غافل تھی۔ چونکہ اس کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس لیے وہ مومن کی ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اور پھر مومن نوکر تھا۔ نوکروں کے متعلق کون غور و فکر کرتا ہے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔

مومن کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ وہ کچھ دنوں سے موڑ مڑتا۔ زندگی کے

ایک راستہ پر آنکلا تھا۔ جو زیادہ لمبا تو نہیں تھا مگر بے حد پر خطر تھا۔ اس راستے پہ اس کے قدم کبھی تیز تیز اٹھتے تھے۔ کبھی ہولے ہولے وہ دراصل جانتا نہیں تھا کہ ایسے راستوں پر کس طرح چلنا چاہیئے۔ انہیں جلدی طے کر جانا چاہیئے۔ یا کچھ وقت لے کر آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر کی چیزوں کا سہارا لے کر طے کرنا چاہیئے۔ مومن کے ننگے پاؤں کے نیچے آنے والے شباب کی گول گول چکنی ٹُنیاں پھسل رہی تھیں۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ بے حد مضطرب تھا۔ اسی اضطراب کے باعث کئی بار کام کرتے کرتے چونک کر وہ غیر ارادی طور پہ کسی کھونٹی کو دو ہاتھوں سے پکڑ لیتا اور اس سے لٹک جاتا۔ پھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ ٹانگوں سے پکڑ کر اسے کوئی اتنا کھینچے کہ وہ ایک مہین تار بن جائے۔ یہ سب باتیں اس کے دماغ کے کسی ایسے گوشے میں پیدا ہوتی تھیں کہ وہ ٹھیک طور پر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔

غیر شعوری طور پہ وہ چاہتا کہ کچھ ہو ——— کیا ہو؟ ——— بس کچھ ہو۔ میز پر قرینے سے چنی ہوئی پلیٹیں۔ ایک دم اچھلنا شروع کر دیں کیتلی پر رکھا ہوا ڈھکنا پانی کے ایک ہی ابال سے اوپر کو جائے۔ نل کی سستی نالی پہ دباؤ ڈالے تو وہ دوہری ہو جائے اور اس میں سے پانی کا ایک فوارہ سا پھوٹ نکلے۔ اسے ایک زبردست انگڑائی آئے۔ کہ اس کے

سارے جوڑ علیحدہ علیحدہ ہو جائیں۔ اور ایک ڈھیلا پن پیدا ہو جائے ۔ کوئی ایسی بات وقوع پذیر ہو جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔

مومن بہت بے قرار تھا۔

رضیہ نئی فلمی طرزیں سیکھنے میں مشغول تھی اور شکیلہ کاغذوں پر بلاؤزوں کے نمونے اتار رہی تھی۔ جب اس نے یہ کام ختم کر لیا تو وہ نمونہ جو ان میں سب سے اچھا تھا، سامنے رکھ کر اپنے لئے اُودی ساٹن کا بلاؤز بنانا شروع کیا۔ اب رضیہ کو بھی اپنا باجا اور فلمی گانوں کی کاپی چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔

شکیلہ ہر کام بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتی تھی۔ جب سینے پرونے بیٹھتی تو اس کی نشست بڑی اطمینان بخش ہوتی تھی۔ اپنی چھوٹی بہن رضیہ کی طرح افراتفری پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک ایک ٹانکا سوچ سمجھ کر بڑے اطمینان سے لگاتی تھی تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ پیمائش بھی اس کی بہت صحیح ہوتی تھی۔ اس لئے کہ وہ پہلے کاغذ کاٹ کر پھر کپڑا کاٹتی تھی یوں وقت زیادہ صرف ہوتا مگر چیز بالکل فٹ تیار ہوتی ہے۔

شکیلہ بھرے بھرے جسم کی صحت مند لڑکی تھی۔ اس کے ہاتھ بہت گُدگُدے تھے۔ گوشت بھری مخروطی انگلیوں کے آخر میں ہر جوڑ پر

ایک ننھا گڑھا تھا۔ جب وہ مشین چلاتی تھی یہ ننھے ننھے گڑھے ہاتھ کی حرکت سے کبھی کبھی غائب بھی ہو جاتے تھے۔

شکیلہ مشین بھی بڑے اطمینان سے چلاتی تھی آہستہ آہستہ اس کی دبلی انگلیاں بڑی رعنائی کے ساتھ مشین کی ہتھی کو گھماتی تھیں، اس کی کلائی میں ایک ہلکا سا خم پیدا ہو جاتا تھا۔ گردن ذرا اس طرف کو جھک جاتی تھی اور بالوں کی ایک لٹ جسے شاید اپنے لئے کوئی مستقل جگہ نہیں ملتی تھی نیچے پھسل آتی تھی۔ شکیلہ اپنے کام میں اس قدر منہمک ہوتی تھی کہ وہ اسے ہٹانے یا جمانے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔

جب شکیلہ اودی ساٹن سامنے پھیلا کر اپنے ناپ کا بلاؤز تراشنے لگی تو اسے ٹیپ کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ ان کا اپنا ٹیپ گھس گھسا کر اب بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ لوہے کا گز موجود تھا مگر اس سے کمر اور سینے کی پیمائش کیسے ہو سکتی تھی۔ اس کے اپنے کئی بلاؤز موجود تھے مگر اب چونکہ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہو گئی تھی، اس لئے وہ ساری پیمائشیں دوبارہ کرنا چاہتی تھی۔

قمیص اتار کر اس نے مومن کو آواز دی۔ جب وہ آ یا تو اس سے کہا "جاؤ مومن، دوڑ کر چھ نمبر سے کپڑے کا گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں۔

مومن کی نگاہیں شکیلہ کی سفید بنیان کے ٹکرائیں۔ وہ کئی بار شکیلہ بی بی کو ایسی بنیانوں میں دیکھ چکا تھا۔ مگر آج اسے ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی نگاہوں کا رخ دوسری طرف پھیر لیا اور گھبراہٹ میں کہا "کیسا گز بی بی جی؟"

شکیلہ نے جواب دیا کپڑے کا گز ـــــ ایک گز تو تمہارے سامنے پڑا ہے۔ یہ لوہے کا ہے۔ ایک دوسرا بھی گز ہوتا ہے۔ جو کپڑے کا بنا ہوتا ہے۔ جاؤ چھ میں جاؤ اور دوڑ کے ان سے یہ گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں۔"

چھ نمبر کا فلیٹ بالکل قریب تھا۔ مومن فوراً ہی کپڑے کا گز لے کر آگیا۔ شکیلہ نے یہ گز اس کے ہاتھ سے لیا اور کہا۔ یہیں ٹھہر جاؤ۔ اسے ابھی واپس لے جانا۔ پھر وہ اپنی بہن رضیہ سے مخاطب ہوئی "ان لوگوں کی کوئی چیز زیادہ دیر اپنے پاس رکھی جائے تو وہ بڑھیا تقاضے کر کر کے پریشان کر دیتی ہے ـــــ ادھر آؤ یہ گز لو اور یہاں سے میرا ناپ لو۔"

رضیہ نے شکیلہ کی کمر اور سینے کا ناپ لینا شروع کیا تو ان کے درمیان کئی باتیں ہوئیں مومن دروازے کی دہلیز میں کھڑا الکلیف وہ خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا۔

رضیہ تم گز کھینچ کر ناپ کیوں نہیں لیتیں ـــــ پچھلی دفعہ بھی یہی ہوا تم

نے ناپ لیا اور میرے بلاؤز کا ستیا ناس ہو گیا۔ اوپر کے حصہ پہ اگر کپڑا فٹ نہ آئے تو اِدھر اُدھر بغلوں میں جھول پڑ جاتے ہیں۔

کہاں کا لوں اور کہاں کا نہ لوں۔ تم تو عجب مخمصے میں ڈال دیتی یہاں کا ناپ لینا شروع کیا تو تم نے کہا ذرا پیچھے کا لو ــــــ ذرا چھوٹا بڑا ہو گیا تو کونسی آفت آجائے گی۔

بھئی واہ ــــــ چیز کے فِٹ ہونے میں ہی تو ساری خوبصورتی ہے۔ ثریا کو دیکھو کیسے فِٹ کپڑے پہنتی ہے۔ مجال ہے جو کہیں شکن پڑے۔ کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے کپڑے، لو اب ناپ لو۔۔۔۔"

یہ کہہ کر شکیلہ نے سانس کے ذریعے سے اپنا سینہ پھلانا شروع کیا۔ جب اچھی طرح پھول گیا تو سانس روک کر اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا "لو اب جلدی کرو۔"

جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا۔ اس کے اندر ربڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔ اس نے گھبرا کر کہا "گز لائیے بی بی جی۔ میں دے آؤں۔"

شکیلہ نے اسے جھڑک دیا "ذرا ٹھہر جاؤ۔"

یہ کہتے ہوئے کپڑے کا گز کھلے ننگے بازو سے لپیٹ لیا۔ جب شکیلہ نے اسے اتارنے کی کوشش تو مومن کو اس کی سفید بغل میں کالے کالے

بالوں کا ایک گچھا نظر آیا۔ مومن کی اپنی بغلوں میں بھی ایسے ہی بال اُگ رہے تھے۔ مگر یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں ۔۔۔ بچپن میں وہ بھٹوں کے کالے اور سنہری بال نکال کر اپنی مونچھیں بنایا کرتا تھا۔ ان کو اپنے بالائی ہونٹ پر جمانے وقت جو اُسے سرسراہٹ محسوس ہوا کرتی تھی۔ اسی قسم کی سرسراہٹ اس خواہش نے اس کے بالائی ہونٹ اور ناک میں پیدا کی۔

شکیلہ کا بازو اب نیچے جھک گیا تھا اور اس کی بغل چھپ گئی تھی مگر مومن اب بھی کالے کالے بالوں کا وہ گچھا دیکھ رہا تھا۔ اس کے تصور میں شکیلہ کا بازو دیر تک ویسے ہی اُٹھا رہا اور بغل میں سے اس کے سیاہ بال جھانکتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد شکیلہ نے مومن کو گز دے دیا اور کہا "جاؤ اُسے دے آؤ کہنا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔

مومن گز واپس دے کر باہر صحن میں بیٹھ گیا۔ اس کے دل و دماغ میں دھندلے دھندلے سے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ دیر تک وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے غیر ارادی طور پر اپنا چھوٹا سا ٹرنک جس میں اس نے عید کے لیے نئے کپڑے بنوا

کر رکھے تھے۔

جب ٹرنک کا ڈھکنا کھلا اور نئے لٹھے کی بو اس کی ناک تک پہنچی تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ نہا دھو کر اور یہ نئے کپڑے پہن کر سیدھا شکیلہ بی بی کے پاس جائے اور اسے سلام کرے ــــ اس کی لٹھے کی شلوار کس طرح کھڑکھڑ کرے گی اور اس کی رومی ٹوپی ....

رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی مومن کی نگاہوں کے سامنے اس کا پھندنا آگیا۔ اور پھندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔ اس نے کپڑوں کے نیچے سے اپنی نئی رومی ٹوپی نکالی اور اس کے نرم اور لچکیلے پھندنے پر ہاتھ پھیرنا شروع ہی کیا تھا کہ اندر سے شکیلہ بی بی کی آواز آئی "مومن"

مومن نے ٹوپی ٹرنک میں رکھی، ڈھکنا بند کیا اور اندر چلا گیا جہاں شکیلہ نمونے کے مطابق اودی ساٹن کے کئی ٹکڑے کاٹ چکی تھی۔ ان چمکیلے اور پھسل پھسل جانے والے ٹکڑوں کو ایک جگہ رکھ کر وہ مومن کی طرف متوجہ ہوئی۔ "میں نے تمہیں اتنی آوازیں دیں۔ سو گئے تھے کیا؟"

مومن کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔ "نہیں بی بی جی۔"

"تو کیا کر رہے تھے؟"

"کچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہو گے۔" شکیلہ یہ سوال کئے جا رہی تھی۔ مگر اس کا

اصل دھیان بلاؤز کی طرف تھا جسے اب اسے کچا کرنا تھا۔
مومن نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔" ٹرنک کھول کر اپنے
نئے کپڑے دیکھ رہا تھا۔ شکیلہ کھلکھلا کر ہنسی۔ رضیہ نے اس کا ساتھ دیا۔
شکیلہ کو ہنستے دیکھ کر مومن کو ایک عجیب سی تسکین محسوس ہوئی۔
اور تسکین نے اس کے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ کوئی ایسی مضحکہ
خیز طور پر احمقانہ حرکت کرے۔ جس سے شکیلہ کو اور زیادہ ہنسنے کا
موقع ملے۔ چنانچہ لڑکیوں کی طرح جھینپ کر اور لہجے میں غنراہٹ پیدا
کر کے اس نے کہا۔" بڑی بی بی جی سے پیسے لے کر میں ریشمی رومال بھی
لاؤں گا۔"
شکیلہ نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔ کیا کرو گے اس رومال کو؟"
مومن نے جھینپ کر جواب دیا۔ گلے میں باندھ لوں گا بی بی جی ۔۔۔
بڑا اچھا معلوم ہوگا" یہ سن کر شکیلہ اور رضیہ دونوں دیر تک ہنستی رہیں۔
"گلے میں باندھو گے تو یاد رکھنا میں اسی سے پھانسی دے دوں گی
تمہیں۔" یہ کہہ کر شکیلہ نے اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کی اور رضیہ
سے کہا۔" کمبخت نے مجھے کام ہی بھلا دیا۔ رضیہ میں نے اسے کیوں
بلایا تھا۔؟"
رضیہ نے جواب نہ دیا اور اس نے نئی فلمی طرز گنگنانا شروع کر دی جو

وہ دو روز سے سیکھ رہی تھی۔ اس دوران میں شکیلہ کو خود یاد آگیا کہ اس نے مومن کو کیوں بلایا تھا۔ "دیکھو مومن میں تمہیں یہ بنیان اتار کر دیتی ہوں دوائیوں کی دکان کے پاس جو ایک نئی دکان کھلی ہے نا۔ وہی جس میں تم اس دن میرے ساتھ گئے تھے وہاں جاؤ اور پوچھ کر آؤ کہ ایسے چھ بنیانوں کا کیا لوگے۔ کہنا ہم پوچھ لیں گے۔ اس لئے رعایت ضرور کرے سمجھ لیا نا۔"

مومن نے جواب دیا "جی ہاں"۔

"اب تم پرے ہٹ جاؤ۔"

مومن باہر نکل کر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد بنیان اس کے قدموں کے پاس آگرا۔ اور اندر سے شکیلہ کی آواز آئی کہنا ہم اسی قسم کی۔ اسی ڈیزائن کی بالکل یہی چیز لیں گے۔ فرق نہیں ہونا چاہیئے۔

مومن نے بہت اچھا کہہ کر بنیان اٹھا لیا جو پسینے کے باعث کچھ کچھ گیلا ہو رہا تھا جیسے کسی نے بھاپ پر رکھ کر فوراً ہی ہٹا لیا ہو۔ بدن کی بو بھی اس میں بسی ہوئی تھی۔ میٹھی میٹھی گرمی بھی تھی۔ یہ تمام چیزیں اس کو بھلی معلوم ہوئیں۔

وہ اس بنیان کو جو بلّی کے بچے کی طرح ملائم تھا اپنے ہاتھوں میں مسلتا

باہر چلا گیا۔ جب بھاؤ واؤ دریافت کر کے بازار سے واپس آیا تو شکیلہ بلاؤز کی سلائی شروع کر چکی تھی۔ اسی ساٹن کے بلاؤز کی جو مومن کی رومی ٹوپی کے پھندنے سے کہیں زیادہ چمکیلی اور لچکدار تھی

یہ بلاؤز شاید عید کے لیے تیار کیا جا رہا تھا کیونکہ عید اب بالکل قریب آ گئی تھی۔ مومن کو ایک دن میں کئی بار بلایا گیا۔ دھاگہ لانے کے لیے۔ استری نکالنے کے لیے، سوئی ٹوٹی تو نئی سوئی لانے کے لیے شام کے قریب جب شکیلہ نے دوسرے روز پر جب باقی کام اٹھا دیا تو وہ دھاگے کے ٹکڑے اور اودی ساٹن کی بیکار کترنیں اٹھانے کے لیے بھی اسے بلایا گیا۔

مومن نے اچھی طرح جگہ صاف کر دی۔ باقی سب چیزیں اٹھا کر باہر پھینک دیں مگر اودی ساٹن کی چمک دار کترنیں اپنی جیب میں رکھ لیں۔ بالکل بے مطلب۔ کیونکہ اسے خود معلوم نہیں کہ وہ ان کو کیا کرے گا۔

دوسرے روز اس نے جیب سے کترنیں نکالیں اور الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیئے۔ دیر تک وہ اس کھیل میں مشغول رہا۔ حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک لچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا۔ مسلتا رہا۔ لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی۔ جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا چھوٹا

سا گچھا دیکھا تھا۔

اس دن بھی اسے شکیلہ نے کئی بار بلایا ـــــ کالی ساٹن کے بلاؤز کی ہر شکل اس کی نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ پہلے جب اسے کچا کیا گیا تھا اس پر سفید دھاگے کے بڑے بڑے ٹانکے جا بجا پھیلے ہوئے تھے پھر اس پر استری کی گئی جس سے سب شکنیں دور ہو گئیں اور چمک بھی دوبالا ہو گئی۔ اس کے بعد کچی حالت ہی میں شکیلہ نے اسے پہلے رضیہ کو دکھایا۔ دوسرے کمرے میں سنگھار میز کے پاس جا کر آئینے میں خود اس کو ہر پہلو سے اچھی طرح دیکھا جب پورا اطمینان ہو گیا تو اسے اتارا جہاں جہاں تنگ یا کھلا تھا وہاں نشان بنائے۔ اس کی ساری خامیاں دور کیں ایک بار پہن کر دیکھا جب بالکل فٹ ہو گیا تو پکی سلائی شروع کر دی۔

ادھر اودی ساٹن کا یہ بلاؤز سیا جا رہا تھا۔ ادھر مومن کے دماغ میں عجیب و غریب خیالوں کے جیسے ٹانکے سے ادھڑ رہے تھے ـــــ جب اسے کمرے میں بلایا جاتا اور اس کی نگاہیں چمکیلی ساٹن کے بلاؤز پر پڑتیں تو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اسے دیکھے۔ صرف چھو کر ہی نہیں دیکھے بلکہ اس کی ملائم اور روئیں دار سطح پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہا ـــــ اپنے کھردرے ہاتھ۔

اس نے اس ساٹن کے ٹکڑوں سے اس کی ملائمی کا اندازہ کر لیا تھا۔

دھاگے جو اس نے ان ٹکڑوں سے نکالے تھے اور بھی زیادہ ملائم ہو گئے تھے۔ جب اس نے ان کا گچھا بنایا تھا تو بناتے وقت اسے معلوم ہوا کہ ان میں ربڑ کی سی لچک بھی ہے۔ وہ جب بھی اندر آکر بلاؤز کو دیکھتا۔ اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے کالے کالے بال۔ مومن سوچتا تھا کیا وہ بھی اس ساٹن ہی کی طرح ملائم ہیں ؟

بلاؤز بالآخر تیار ہو گیا ـــ مومن کمرے کے فرش گیلا کپڑا پھیر رہا تھا کہ شکیلہ اندر آئی۔ قمیص اتار کر اس نے پلنگ پر رکھی۔ اس کے نیچے اسی قسم کا سفید بنیان تھا۔ جس کا نمونہ لے کر مومن بھاؤ دریافت کرنے گیا تھا اس کے اوپر شکیلہ نے اپنے ہاتھ کا سلا ہوا بلاؤز پہنا سامنے کے ہُک لگائے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

مومن نے فرش صاف کرتے کرتے آئینے کی طرف دیکھا۔ بلاؤز میں اب جان سی پڑ گئی تھی۔ ایک دو جگہ پر وہ اس قدر چمکتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ساٹن کا رنگ سفید ہو گیا ہے۔

شکیلہ کی پیٹھ مومن کی طرف تھی۔ جس پر ریڑھ کی ہڈی کی لمبی جھری بلاؤز فِٹ ہونے کے باعث اپنی پوری گہرائی کے ساتھ نمایاں تھی۔ مومن سے نہ رہا گیا۔ چنانچہ اس نے کہا۔ بی بی جی آپ نے تو درزیوں کو بھی مات

کر دیا۔

شکیلہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوئی مگر وہ رضیہ کی رائے طلب کرنے کے لئے بے قرار تھی۔ اس لئے وہ صرف "اچھا سلا ہے نا" کہہ کر باہر دوڑ گئی ـــــ مومن آئینے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ جس میں بلاؤز کا سیاہ اور چمکیلا عکس دیر تک موجود رہا۔

رات کو جب وہ پھر اس کمرے میں صراحی رکھنے کے لئے آیا تو اس نے کھونٹی پر لکڑی کے ہینگر میں اس بلاؤز کو دیکھا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا چنانچہ آگے بڑھ کر پہلے اس نے اسے غور سے دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے اس پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے یہ محسوس ہوا کہ کوئی اس کے جسم کے ملائم روئیں پر ہولے ہولے بالکل ہوائی لمس کی طرح ہاتھ پھیر رہا ہے۔

رات کو جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے۔ ڈپٹی صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر اسے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا۔ یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے۔ جن کا گولا بنا ہوا تھا ـــــ پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنا شروع ہوئے ـــــ بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے ـــــ پھر آندھی آگئی

اور مومن کی رومی ٹوپی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا — پھندنے کی تلاش میں وہ نکلا...... دیکھی ان دیکھی جگہوں پر گھومتا رہا..... نشے بھٹے کی بُو بھی کہیں سے آنا شروع ہوئی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا.... ایک کالی ساٹن کے بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا.... کچھ دیر وہ اس دھڑکتی ہوئی چیز پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اسے خوف، تعجب اور ایک انوکھی ٹیس کا احساس ہوا۔ اس کی حالت اس وقت عجیب و غریب تھی... پہلے اُسے تکلیف دہ حرارت محسوس ہوئی تھی۔ مگر چند لمحات کے بعد ایک ٹھنڈی سی لہر اُس کے جسم پر رینگنے لگی۔

دو ہزار سال بعد

خاوند: میں نے کہا۔۔۔۔ سنتی ہو۔

بیوی: سن تو رہی ہوں۔ بولو

خاوند: ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے کہ۔۔۔۔

بیوی: مجھے یاد آیا یہ دھوبی تمہارے کالر کب استری کر کے لائے گا۔

خاوند: لے آئے گا ۔۔۔ آج کل بڑے دنوں کے باعث کام بھی تو بہت ہو گا اس کے پاس ۔۔۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ایک بہت بڑے عالم نے۔۔۔۔۔۔

بیوی: اور وہ حلوہ سوہن کدھر گیا ۔۔۔ مجھے کل اپنی سہیلیوں کی ٹی پارٹی کرنا ہے۔ بلقیس ناراض ہو جائے گی اگر تم حلوہ نہ لائے۔

خاوند: لے آؤں گا۔ ٹی پارٹی آج تھوڑے ہے۔ کل لے آؤں گا چاندنی

چوک یہاں سے دور نہیں ــــ ہاں تو ــــ ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے۔

بیوی:۔ ٹھہرو۔ تم نے چاندنی چوک کہا تو مجھے ایک ضروری بات یاد آگئی میرا سوئیٹر بالکل پھٹ گیا ہے۔ ادھر جاؤ گے تو ایک نیا لیتے آنا۔ نمبر تو تمہیں یاد ہی ہے۔

خاوند:۔ مجھے اپنا پل اوور بھی لانا ہے۔ کل نہیں تو پرسوں دونوں لیتا آؤں گا اور اگر تمہیں جلدی ہے تو خود جا کر لے آؤ۔ نوکر کو ساتھ لے جانا ــــ ــــ ہاں تو میں کہہ رہا تھا ــــ ہاں ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے . . . . . .

بیوی:۔ تم چھوڑو اور باتوں کو ــــ بھئی تمہارے اس نوکر مجھے بہت تنگ کیا ہے۔ پرلے درجے کا جھوٹا ہے۔ بد زبان ہے اور مجھے خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور اب بھی کہتی ہوں کہ اس کا حساب صاف کرو۔ دو مہینے کی تنخواہ تو ہے ــــ اس کو چھٹی دو اور نیا نوکر تلاش کرو۔

خاوند:۔ کتنے نوکر آچکے ہیں۔ سب ایک جیسے ہی تھے ــــ میں تو سمجھتا ہوں کہ نوکروں میں کوئی فرق ہی نہیں ہوتا اور اب جو تم کہتی ہو تو خیر مانے لیتا ہوں کل اس کا حساب چکا دوں گا۔ اور نئے نوکروں ــــ کے

لیے اپنے چند دوستوں سے کہہ دوں گا — تو — تو — ہاں
تو میں اس عالم کی بات کہہ رہا تھا۔ وہ کہتا ہے۔

بیوی:۔ ٹھہرو — یہ منّے کے رونے کی آواز تو نہیں۔

خاوند:۔ نہیں تو — کیوں خیریت تو ہے ؟

بیوی:۔ کل سے اس کے دشمنوں کی طبیعت خراب ہے تم تو سارا دن دفتر میں رہتے ہو۔ اور دفتر سے آتے ہو تو کلب گھر چلے جاتے ہو تمہیں اس کی خیریت سے کیا واسطہ۔

خاوند:۔ لو بھئی تم نے تو گلے شکوے شروع کر دیئے — چھوڑو ان باتوں کو اور سنو تمہیں ایک مزید ارباب سناتا ہوں — ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے . . . . . .

بیوی:۔ پہلے میری بات کا جواب دو۔

خاوند:۔ بولو ؟

بیوی:۔ نہیں پھر پوچھوں گی — اچھا بھلا بتاؤ تو میری سالگرہ کب ہے۔

خاوند:۔ مجھے تاریخ اچھی طرح یاد ہے اور مجھے اپنا وعدہ بھی یاد ہے۔ تمہیں سالگرہ کے روز صبح سویرے اپنی پسند کی ساڑھی مل جائے گی۔ لو بس اب خوش ہوئیں — ہاں تو — میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے۔

بیوی:۔ ساڑھی وہی ہو جس پر مور بنے ہیں۔ بلاؤز کا کپڑا بھی وہی لوں گی۔ جو میں نے پسند کیا ہوا ہے ـــــ اچھا اب بتاؤ اُس نے کیا کہا ہے ؟

خاوند:۔ ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے کہ دو ہزار سال کے بعد دنیا پر عورتوں کا راج ہوگا۔ پر میں اب سوچتا ہوں کہ دو ہزار سال بعد کیوں ؟ ۔۔۔۔

آم

خزانے کے تمام کلرک جانتے تھے کہ منشی کریم بخش کی رسائی بڑے صاحب تک بھی ہے۔ چنانچہ وہ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ ہر مہینے پنشن کے کاغذ بھرنے اور روپیہ لینے کے لیے جب وہ خزانے میں آتا تو اس کا کام اسی وجہ سے جلد جلد کر دیا جاتا۔ پچاس روپے اس کو اپنی تیس سالہ خدمات کے عوض ہر مہینے سرکار کی طرف سے ملتے تھے۔ ہر مہینے دس دس کے پانچ نوٹ وہ اپنے خفیف طور پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پکڑتا۔ اور اپنے پرانے وضع کے لمبے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیتا۔ چشمے میں سے خزانچی کی طرف تشکر بھری نظروں سے دیکھتا اور یہ کہہ کر "اگر زندگی ہوئی تو اگلے مہینے پھر سلام کرنے کے لیے حاضر ہوں گا۔" بڑے صاحب کے کمرے کی طرف چلا جاتا۔

آٹھ برس سے اس کا یہی دستور تھا۔ خزانے کے قریب قریب ہر کلرک کو معلوم تھا کہ منشی کریم بخش جو مطالبات خفیہ کی کچہری میں کبھی محافظِ دفتر ہوا کرتا تھا۔ بیحد وضعدار، شریف الطبع اور حلیم آدمی تھا۔ منشی کریم بخش واقعی ان صفات کا مالک تھا۔ کچہری میں اپنی طویل ملازمت کے دوران میں افسران بالا نے ہمیشہ اس کی تعریف کی ہے۔ بعض منصفوں کو منشی کریم بخش سے محبت ہو گئی تھی۔ اس کے خلوص کا ہر شخص قائل تھا۔

اس وقت منشی کریم بخش کی عمر پینسٹھ سے کچھ اوپر تھی۔ بڑھاپے میں آدمی عموماً کم گو اور حلیم ہو جاتا ہے۔ مگر وہ جوانی میں ایسی ہی طبیعت کا مالک تھا۔ دوسروں کی خدمت کرنے کا شوق اس عمر میں بھی ویسے کا ویسا ہی قائم تھا۔

خزانے کا بڑا افسر منشی کریم بخش کے ایک مربی اور مہربان جج کا لڑکا تھا۔ جج صاحب کی وفات پر اسے بہت صدمہ ہوا تھا۔ اب وہ ہر مہینے ان کے لڑکے کو سلام کرنے کی غرض سے ضرور ملتا تھا۔ اس سے اسے بہت تسکین ہوتی تھی۔ منشی کریم بخش انہیں چھوٹے جج صاحب کہا کرتا تھا۔

پنشن کے پچاس روپے جیب میں ڈال کر وہ برآمدہ طے کرتا اور چق لگے کمرے کے پاس جا کر اپنی آمد کی اطلاع کراتا۔ چھوٹے جج صاحب

اس کو زیادہ دیر تک باہر کھڑا نہ رکھتے۔ فوراً اندر بلا لیتے اور سب کام چھوڑ کر اس سے باتیں شروع کر دیتے۔

"تشریف رکھیے منشی صاحب ـــــ فرمائیے مزاج کیسا ہے؟"

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے ـــــ آپ کی دعا سے بڑے مزے میں گذر رہی ہے، میرے لائق کوئی خدمت؟"

"آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیے۔ خدمت گذاری تو بندے کا کام ہے۔"

"آپ کی بڑی نوازش ہے۔"

اس قسم کی رسمی گفتگو کے بعد منشی کریم بخش جج صاحب کی مہربانیوں کا ذکر چھیڑ دیتا۔ ان کے بلند کردار کی حفاظت بڑے فدویانہ انداز میں کرتا اور بار بار کہتا۔ اللہ بخشے مرحوم فرشتہ خصلت انسان تھے خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔"

منشی کریم بخش کے لہجے میں خوشامد وغیرہ کی ذرہ بھر ملاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ جو کچھ کہتا تھا، محسوس کر کے کہتا تھا۔ اس کے متعلق جج صاحب کے لڑکے کو جواب خزانے کے بڑے افسر تھے، اچھی طرح معلوم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کو عزت کے ساتھ بٹھاتے تھے، اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

ہر مہینے دوسری باتوں کے علاوہ منشی کریم بخش کے اسم کے باغوں کا ذکر بھی آتا تھا موسم آنے پہ جج صاحب کے لڑکے کی کوٹھی پہ آموں کا ایک ٹوکرا پہنچ جاتا تھا منشی کریم بخش کو خوش کرنے کے لئے وہ ہر مہینے اس کو یاد دہانی کرا دیتے تھے "منشی صاحب، دیکھئے اس موسم پہ آموں کا ٹوکرا بھیجنا نہ بھولئے گا"

پچھلی بار آپ نے جو آم بھیجے تھے اس میں تو صرف دو میرے حصے میں آئے تھے۔

کبھی یہ تین ہو جاتے تھے۔ کبھی چار اور کبھی صرف ایک ہی رہ جاتا تھا منشی کریم بخش یہ سن کر بہت خوش ہوتا تھا حضور ایسا کبھی ہو سکتا ہے — جوں ہی فصل تیار ہوئی میں فوراً ہی آپ کی خدمت ٹوکرہ لے کر حاضر ہو جاؤں گا — دو کیسے دو حاضر کر دوں گا۔ یہ باغ کس کے ہیں — آپ ہی کے تو ہیں"

"کبھی کبھی چھوٹے جج صاحب پوچھ لیا کرتے تھے" منشی جی آپ کے باغ کہاں ہیں؟"

دنیا نگر میں حضور — زیادہ نہیں ہیں صرف دو ہیں اس میں سے ایک تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو دے رکھا ہے جو ان دونوں کا انتظام وغیرہ کرتا ہے۔

مئی کی پنشن لینے کے لئے منشی کریم بخش جون کی دوسری تاریخ کو خزانے گیا۔ دس دس کے پانچ نوٹ اپنے خفیف طور پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کر اس نے چھوٹے جج صاحب کے کمرے کا رخ کیا۔ حسب معمول ان دونوں میں وہی رسمی باتیں ہوئیں آخر میں آموں کا ذکر بھی آیا۔ جس پر منشی کریم بخش نے کہا۔ "دینا نگر سے چھٹی آئی ہے کہ ابھی آموں کے منہ پر چیپ نہیں آیا۔ جوں ہی چیپ آ گیا اور فصل پک کر تیار ہو گئی۔ میں فوراً پہلا ٹوکرا لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا ــــــ چھوٹے جج صاحب! اس دفعہ ایسے تحفے آم ہوں گے کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ ملائی اور شہد کے گھونٹ نہ ہوئے تو میرا ذمہ۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ چھوٹے جج صاحب کے لئے ایک ٹوکرا خاص طور پر بھروا دیا جائے۔ اور سواری گاڑی سے بھیجا جائے۔ تاکہ جلدی اور احتیاط سے پہنچے۔ دس پندرہ روز آپ کو اور انتظار کرنا پڑے گا۔

چھوٹے جج صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ منشی کریم بخش نے اپنی چھتری اٹھائی اور خوش خوش گھر واپس آ گیا۔

گھر میں اس کی بیوی اور بڑی لڑکی تھی۔ بیاہ کے دوسرے سال جس کا خاوند مر گیا تھا۔ منشی کریم بخش کی اور کوئی اولاد نہیں تھی مگر اس مختصر کنبے کے باوجود پچاس روپوں میں اس کا گذر بہت ہی مشکل سے

سے ہوتا تھا۔ اسی تنگی کے باعث اس کی بیوی کے تمام زیور سات آٹھ برسوں میں آہستہ آہستہ بک گئے تھے۔

منشی کریم بخش فضول خرچ نہیں تھا۔ اس کی بیوی اور وہ بڑے کفایت شعار تھے۔ مگر اس کفایت شعاری کے باوصف تنخواہ میں سے ایک پیسہ بھی ان کے پاس نہ بچتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ منشی کریم بخش چند آدمیوں کی خدمت کرنے میں بے حد مسرت محسوس کرتا تھا۔ ان چند خاص الخاص آدمیوں کی خدمت گذاری میں جس سے اسے دلی عقیدت تھی

ان خاص آدمیوں میں سے ایک توجج صاحب کے لڑکے تھے۔

دوسرے ایک اور افسر تھے۔ جو ریٹائر ہو کر اپنی زندگی کا بقایا حصہ ایک بہت بڑی کوٹھی میں گذار رہے تھے۔ ان سے منشی کریم بخش کی ملاقات ہر روز صبح سویرے کمپنی باغ میں ہوتی تھی۔

باغ کی سیر کے دوران میں منشی کریم بخش ان سے ہر رفتہ پچھلے دن کی خبریں سنتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ بیٹھتے ہوئے دنوں کے تار چھیڑ دیتا تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب اپنی بہادری کے قصے سنانا شروع کر دیتے تھے کہ کس طرح انہوں نے لائل پور کے جنگلی علاقے میں ایک خونخوار قاتل کو، پستول، خنجر دکھائے بغیر گرفتار کیا اور کس طرح ان کے رعب سے ایک ڈاکو سارا مال چھوڑ کر بھاگ گیا۔

کبھی کبھی منشی کریم بخش کے آم کے باغوں کا بھی ذکر آجاتا تھا، منشی صاحب کہئے۔ اب کی دفعہ فصل کیسی رہی؟" پھر چلتے چلتے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب یہ بھی کہتے "

پچھلے سال آپ نے جو آم بھجوائے تھے۔ بہت ہی اچھے تھے، بے حد لذیذ تھے۔

انشاءاللہ خدا کے حکم سے اب کی دفعہ بھی ایسے ہی آم حاضر کروں گا ایک ہی بوٹے کے ہوں گے۔ ویسے ہی لذیذ، بلکہ پہلے سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی ہوں گے۔"

اس آدمی کو بھی منشی کریم بخش ہر سال موسم پر ایک ٹوکرہ بھیجتا تھا کوٹھی میں ٹوکرہ نوکروں کے حوالے کر کے جب ڈپٹی صاحب سے ملتا اور وہ اس کا شکریہ ادا کرتے تو منشی کریم بخش نہایت ہی انکساری سے کام لیتے ہوئے کہتا ڈپٹی صاحب آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ اپنے باغ میں سے اگر ایک ٹوکرہ یہاں لے آیا تو کیا ہوگیا۔ بازار سے ایک چھوڑ کئی ٹوکرے منگوا سکتے ہیں۔ یہ آم اپنے باغ کے ہیں اور باغ میں صرف ایک بوٹا ہے جس کے سب دانے گھلاوٹ خوشبو اور مٹھاس میں ایک جیسے ہیں۔ اس لئے یہ چند تحفے کے طور لے آیا۔"

آم دینے کے بعد جب وہ کوٹھی سے باہر نکلتا تو اس کے چہرے

پر تمتماہٹ ہوتی تھی۔ ایک عجیب قسم کی روحانی تسکین اُسے محسوس ہوتی تھی جو کئی دنوں تک اس کو مسرور رکھتی تھی۔

منشی کریم بخش اکہرے جسم کا آدمی تھا۔ بڑھاپے نے اس کے بدن کو ڈھیلا کر دیا تھا۔ مگر یہ ڈھیلا پن بدصورت معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہاتھوں کی پھولی ہوئی رگیں۔ سر کا خفیف سا ارتعاش اور چہرے کی گہری لکیریں اس کی متانت و سنجیدگی میں اضافہ کرتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑھاپے نے اس کو نکھار دیا ہے۔ کپڑے بھی وہ صاف ستھرے پہنتا تھا جس سے یہ نکھار ابھر آتا تھا۔

اس کے چہرے کا رنگ سفیدی مائل زرد تھا۔ پہلے پہلے ہونٹ جو دانت نکل جانے کے باعث اندر کی طرف سمٹے رہتے تھے ہلکے سُرخ تھے۔ خون کی اس کمی کے باعث اس کے چہرے پر ایسی صفائی پیدا ہو گئی تھی۔ جو اچھی طرح منہ دھونے کے بعد تھوڑی دیر تک قائم رہا کرتی تھی۔

وہ کمزور تھا۔ پینسٹھ برس کی عمر میں کون کمزور نہیں ہو جاتا مگر اس کمزوری کے باوجود اس میں کئی کئی میل پیدل چلنے کی ہمت تھی خاص طور پر جب آموں کا موسم آتا تو وہ ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کو آموں کے ٹوکرے بھیجنے کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کرتا

تھا کہ بیس پچیس برس کے جوان آدمی بھی کیا کریں گے۔ بڑے اہتمام سے ٹوکرے کھولے جاتے تھے۔ ان کا گھاس پھوس الگ کیا جاتا۔ داغی یا گلے سڑے دانے الگ کئے جاتے تھے۔ اور صاف ستھرے آم نئے ٹوکروں میں گن کر ڈالے جاتے تھے۔ منشی کریم بخش ایک بار پھر اپنا اطمینان کرنے کی خاطر ان کو گن لیتا تھا۔ تاکہ بعد میں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

آم نکالتے اور ٹوکروں میں ڈالتے وقت منشی کریم بخش کی بہن اور اس کی بیوی کے منہ میں پانی بھر آتا۔ مگر وہ دونوں خاموش رہتیں۔ بڑے بڑے رس بھرے خوبصورت آموں کا ڈھیر دیکھ کر جب ان میں سے کوئی یہ کہے بغیر نہ رہ سکتی۔ کیا ہرج ہے اگر اس ٹوکرے میں سے دو آم نکال لئے جائیں؟ تو منشی کریم بخش سے یہ جواب ملتا: "اور آجائیں گے اتنا بیتاب ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

یہ سن کر وہ دونوں چپ ہو جاتیں اور اپنا کام کرتی رہتیں۔

جب منشی کریم بخش کے گھر میں آموں کے ٹوکرے آتے تھے۔ تو گلی کے سارے آدمیوں کو اس کی خبر لگ جاتی تھی۔ عبداللہ نیچہ بند کا لڑکا جو کبوتر پالنے کا شوقین تھا۔ دوسرے روز ہی آ دھمکتا تھا اور منشی کریم بخش کی بیوی سے کہتا تھا: خالہ میں گھاس لینے کے لئے آیا ہوں۔ کل خالو جان آموں کے دو ٹوکرے لائے تھے۔ ان میں سے جتنی گھاس

نکلی ہو مجھے دے دیجئے۔

ہمسائی نوراں جس نے کئی مرغیاں پال رکھی تھیں اسی روز شام کو ملنے آجاتی تھی اور ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا کرتی تھی پچھلے برس جو تم نے مجھے ایک ٹوکرہ دیا تھا۔ بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ اب کے بھی ایک ٹوکرہ دیدو تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

دونوں ٹوکرے اور ان کی گھاس یوں چلی جاتی۔

حسب معمول اس دفعہ بھی آموں کے دو ٹوکرے آئے گلے سڑے دانے الگ کئے گئے جو اچھے تھے ان کو منشی کریم بخش نے اپنی نگرانی میں گنوا کر نئے ٹوکروں میں رکھوایا۔ بارہ بجے سے پہلے یہ کام ختم ہو گیا چنانچہ دونوں ٹوکرے غسل خانے میں ٹھنڈی جگہ رکھ دیئے گئے۔ تاکہ آم خراب نہ ہو جائیں۔

ادھر سے مطمئن ہو کر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد منشی کریم بخش کمرے میں چارپائی پر لیٹ گیا۔

جون کے آخری دن تھے اس قدر گرمی تھی کہ دیواریں توے کی طرح تپ رہی تھیں وہ گرمیوں میں عام طور پر غسل خانے کے اندر ٹھنڈے فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹا کرتا تھا۔ یہاں موری کے رستے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی آجاتی تھی۔ لیکن اب کے اس میں دو بڑے بڑے ٹوکرے پڑے

تھے۔ اس کو گرم کمرے ہی میں جو بالکل تنور بنا ہوا تھا۔ چھ بجے تک وقت گذارنا تھا۔

ہر سال گرمیوں کے موسم میں جب آموں کے یہ ٹوکرے آتے تھے اسے ایک دن آگ کے بستر پر گذارنا پڑتا تھا۔ مگر وہ اس تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا تھا۔ قریباً پانچ گھنٹے تک چھوٹا سا پنکھا بار بار پانی میں تر کر کے جھلتا رہتا۔ انتہائی کوشش کرتا کہ نیند آجائے مگر پل کے لئے بھی اُسے آرام نصیب نہ ہوتا۔ جون کی گرمی اور ضدی قسم کی مکھیاں کسے سونے دیتی ہیں۔

آموں کے ٹوکرے غسل خانے میں رکھوا کر جب وہ گرم کمرے میں بیٹا تو پنکھا جھلتے جھلتے ایک دم اس کا سر چکرایا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پھر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا سانس اُکھڑ رہا ہے۔ اور وہ سارے کا سارا گہرائیوں میں اُتر رہا ہے۔ اس قسم کے دورے اسے کئی بار پڑ چکے تھے۔ اس لئے کہ اس کا دل کمزور تھا۔ مگر ایسا زبردست دورہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ سانس لینے میں اس کو بڑی دقت محسوس ہونے لگی۔ سر بہت زور سے چکرانے لگا۔ گھبرا کر اس نے آواز دی اور اپنی بیوی کو بلایا۔

یہ آواز سن کر اس کی بیوی اور لڑکی دونوں دوڑی دوڑی اندر آئیں

دونوں جانتی تھیں کہ اسے اس قسم کے دورے کیوں پڑتے ہیں۔ فوراً ہی اس کی بہن نے عبداللہ نیچہ بند کے لڑکے کو بلایا اور اس سے کہا کہ ڈاکٹر کو بلا لائے تاکہ وہ طاقت کی سوئی لگا دے۔ لیکن چند منٹوں ہی میں منشی کریم بخش کی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بے قراری اس قدر بڑھ گئی کہ وہ چارپائی پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی بیوی اور بہن نے یہ دیکھ شور برپا کر دیا۔ جس کے باعث آس پاس کے کئی آدمی جمع ہو گئے۔

بہت کوشش کی گئی۔ اس کی حالت ٹھیک ہو جائے لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ڈاکٹر بلانے کے لئے تین چار آدمی دوڑائے گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی واپس آئے، منشی کریم بخش زندگی کے آخری سانس لینے لگا۔ بڑی مشکل سے کروٹ بدل کر اس نے عبداللہ نیچہ بند کو جو اس کے پاس ہی بیٹھا تھا، اپنی طرف متوجہ کیا اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا "تم سب لوگ باہر چلے جاؤ۔ میں اپنی بیوی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

سب لوگ باہر چلے گئے۔ اس کی بیوی اور بہن دونوں اندر داخل ہوئیں رو رو کر ان کا برا حال ہو رہا تھا۔ منشی کریم بخش نے اشارے سے اپنی بیوی کو پاس بلایا اور کہا "دونوں ٹھوکریں آج شام ہی ڈپٹی صاحب

اور چھوٹے جج صاحب کی کوٹھی پر ضرور پہنچ جاتے چاہئیں پڑے پڑے خراب ہو جائیں گے۔"

اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔ "دیکھو تمہیں میری سے میری موت کے بعد بھی کسی کو آموں کا راز معلوم نہ ہو۔ کسی سے نہ کہنا کہ یہ آم ہم بازار سے خرید کر لوگوں کو بھیجتے تھے۔ کوئی پوچھے تو یہی کہنا کہ دینا نگر میں ہمارے باغ ہیں۔ . . . . بس . . . . اور دیکھو جب میں مرجاؤں تو چھوٹے جج صاحب اور ڈپٹی صاحب کو ضرور اطلاع بھیج دینا۔"

چند لمحات کے بعد منشی کریم بخش مرگیا۔ اس کی موت سے ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کو لوگوں نے مطلع کر دیا۔ مگر دونوں چند ناگزیر مجبوریوں کے باعث جنازے میں شامل نہ ہو سکے۔

تین اُنگلیاں

افراد

باٹلی والا ...... شوہر　　شیریں .... بیوی

جگن ناتھ ...... جوہری　　کرنل امرت ناتھ ...... مہمان

پولیس انسپکٹر اور تین سپاہی

ایکٹ پہلا

پہلا منظر

ایک پُر تکلف طریقے سجا ہوا ڈرائنگ روم کھڑکیوں پر ریشمی پردے لٹک رہے ہیں قالین بچھا ہوا ہے جو کہ بہت دبیز ہے۔

باٹلی والا ایک صوفے پر اضطراب کے ساتھ اپنی ٹانگ ہلا رہا ہے عقب میں گھر کا نوکر تپائی پہ رکھے ہوئے پھولدار کو جھاڑن سے صاف کرنے میں مشغول، گھنٹی بجتی ہے۔ باٹلی والا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

باٹلی والا:۔ وہ آ گئے (سنتو سے) دیکھو باہر کون ہے — میرا خیال ہے کہ لالہ جگن ناتھ ہوں گے۔ جاؤ اگر وہی ہوں تو انہیں اندر لے آؤ کہنا کہ صاحب آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔

(بہت اچھا سرکار) (سنتو چلا جاتا ہے)

باٹلی والا:۔ میرا خیال ہے جگن ناتھ ہوگا۔ یہ جوہری وقت اور زبان کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔

(سنتو اور جگن ناتھ دونوں کمرے میں داخل ہوتے ہیں)

سنتو:۔ صاحب لالہ جی تشریف لے آئے ہیں۔

باٹلی والا:۔ آئیے آئیے۔ لالہ جی تشریف لے آئیے — خوب وقت پہ آئے۔

جگن ناتھ:۔ آپ نے یاد جو فرمایا تھا۔

باٹلی والا:۔ ادھر کرسی پر تشریف رکھیے — سنتو اب تم جا سکتے ہو۔

آپ تشریف رکھیئے۔

(سنتو چلا جاتا ہے)

جگن ناتھ۔ فرمائیے! کیسے یاد کیا؟

باٹلی والا۔ میں ابھی سب کچھ عرض کرتا ہوں پہلے آپ فرمائیے کہ آپ کیا پیئیں گے۔ آج سردی خوب زوروں پہ ہے۔

جگن ناتھ۔ جی نہیں تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔

باٹلی والا۔ لالہ جی میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ مجھے موتیوں کے ایک ہار کی قیمت دریافت کرنا ہے۔

جگن ناتھ۔ ہار لائیے۔

باٹلی والا: ہار تو میرے پاس نہیں۔

جگن ناتھ۔ تو میں قیمت کیسے بتاؤں؟

باٹلی والا۔ (ہنس کر) میں ہار دکھائے بغیر آپ سے قیمت دریافت نہیں کروں گا۔ میں ابھی ہار منگاتا ہوں۔ میری بیوی کے پاس ہے۔

جگن ناتھ۔ آپ اسے بیچنا چاہتے ہیں؟

باٹلی والا۔ ارادہ تو یہی ہے اگر قیمت اچھی مل جائے —— اچھا تو میں ابھی ہار لے کر حاضر ہوتا ہوں۔

جگن ناتھ۔ بہت بہتر ہے۔

باٹلی والا۔ اگر کچھ دیر ہو جائے تو معاف فرما دیجئے گا۔

جگن ناتھ۔ نہیں کوئی بات نہیں۔ مگر آپ جلدی واپس آنے کی کوشش کیجئے گا۔ کیونکہ مجھے دکان پر جانا ہے۔

باٹلی والا۔ میں ابھی حاضر ہوا۔

(کمرے سے باہر چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر

ڈرائنگ روم کے ساتھ والا کمرہ خواب، یہ بھی پر تکلف ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ ایک خوبصورت پلنگ پر تکیوں کا سہارا لے کر مسز باٹلی والا (شیریں) لیٹی ہے۔ خاوند کے قدموں کی آواز سنتی ہے۔ لیکن حرکت نہیں کرتی۔ وہ اندر داخل ہوتا ہے۔ اور اس کے پاس آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ شیریں اس کی طرف بالکل بے توجہی سے دیکھتی ہے۔

باٹلی والا۔ شیریں۔

شیریں۔ (روکھے پن سے) کیا ہے؟

باٹلی والا۔ تم ابھی تک سو رہی ہو۔

شیریں۔ تو کیا کروں؟

باٹلی والا:۔ اٹھو کوئی بات چیت کرو۔

شیریں:۔ آج میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔

باٹلی والا:۔ کئی دنوں سے تم اس درد کی شکایت کر رہی ہو ۔۔۔۔ کسی ڈاکٹر کو بلواؤں ؟

شیریں:۔ نہیں ۔۔ تمہاری بہت مہربانی ہے۔

باٹلی والا:۔ تم مجھ سے ابھی تک ناراض ہو؟

شیریں:۔ کاش کہ میں ہو سکتی۔

باٹلی والا:۔ تم بات بات پر ٹھنڈی سانسیں بھرنا شروع کر دیتی ہو۔

شیریں:۔ قسمت میں ہے جو بھی۔

باٹلی والا:۔ قسمت کا گلہ ابھی تک تمہاری زبان پر ہے۔

شیریں:۔ زندہ جو ہوں۔

باٹلی والا:۔ تمہارے یہ زہر میں بجھے ہوئے تیر ابھی تک ختم نہیں ہوئے۔

شیریں:۔ میری رگ رگ میں تم خود زہر بھر چکے ہو۔

باٹلی والا:۔ تمہیں میری قسموں کا اعتبار نہیں آیا۔

شیریں:۔ آ جاتا اگر تمہاری آنکھوں میں ہر وقت ایک سیال خطرہ تیرتا نظر نہ آتے۔

باٹلی والا:۔ خطرہ! ۔۔ کس بات کا خطرہ۔

شیریں:۔ جانے دو ان باتوں کو ۔۔۔ کہو کیسے آئے ؟

باٹلی والا:۔ ایک دوست ابھی ابھی ملنے کے لئے آئے ہیں۔ باتوں باتوں تمہارے ہار کا تذکرہ ہوا۔ میں نے بہت تعریف کی۔ چنانچہ وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ۔۔۔ یہاں کے بہت جوہری ہیں

شیریں:۔ میرے صندوقچے میں پڑا ہے۔ لے جاؤ ۔۔۔ یہ ۔۔۔

باٹلی والا:۔ یہ کیا ؟

شیریں:۔ کچھ نہیں ۔

باٹلی والا:۔ کچھ تو ہے ۔

شیریں:۔ کہہ جو دیا ۔ کچھ نہیں ۔

باٹلی والا:۔ تمہاری مرضی لیکن تمہارے من میں کوئی بات ضرور ہے ۔

(شیریں پلنگ پر سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھ جاتی ہے اور اپنی انگلیوں کے ناخن رگڑنا شروع کر دیتی ہے ۔

شیریں:۔ تمہارا خیال صحیح ہے ۔۔۔ دراصل میں بہت تھکی ہو گئی ہوں ۔ جاؤ اپنے جوہری دوست کو ہار دکھا آؤ۔ پھر بات کریں گے ۔ (باٹلی والا اٹھ کر ڈریسنگ پر سے ایک صندوقچہ اٹھاتا ہے)

باٹلی والا:۔ اس صندوقچے میں ہے ؟

شیریں:۔ اسی میں ہے ۔

باٹلی والا: تم اپنی قیمتی چیزوں کو یوں کھلے صندوقچے میں کیوں رکھا کرتی ہو؟
کچھ احتیاط تو ہونی چاہیئے۔

شیریں: مجھے زیوروں سے اب کوئی دلچسپی نہیں۔

باٹلی والا: تعجب ہے۔

شیریں: واقعی تعجب ہے۔

باٹلی والا: تعجب ہے کہ اتنے سستے داموں پر یہ ہار مجھے کیسے مل گیا تھا؟
ایسے خوبصورت اور گول موتی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھے ــ
یہ بھی تعجب ہے کہ اس بارے میں تمہیں کوئی دلچسپی نہیں رہی ــــ
شیریں تمہیں ٹھیک رقم یاد ہوگی۔ کتنے میں یہ ہار ہم نے خریدا تھا؟

شیریں: تم نے شادی سے پہلے لیا تھا ــ جب تم مجھ سے محبت کیا کرتے تھے۔

باٹلی والا: مجھے یاد آگیا میں نے اسے سنگاپور میں چالیس ہزار روپے کا لیا تھا ــ بہت سستا سودا تھا اس غریب کو روپے کی اشد ضرورت تھی ــ بہت سستا سودا تھا کیوں شیریں؟

شیریں: سودا بے شک سستا تھا مگر سنئے سودے سستے ہی ہوتے ہیں اگر مجھے حاصل کرنے کے لئے تمہیں کوئی بڑی قربانی کرنی پڑتی تو آج حالات بالکل مختلف ہوتے ــ اصل میں عورت ہمیشہ بہت سستے

دامنوں پر اپنا آپ حوالے کر دیتی ہے۔

باٹلی والا:۔ اس موقع کو پانچ برس ہو گئے۔ پانچ برس ——— کتنے انقلاب آ چکے ہیں۔ مگر یہ ہار ویسے کا ویسے چمکیلا ہے ——— تمہارے دانت بھی کبھی اسی طرح چمکا کرتے تھے۔

شیریں:۔ کبھی۔

باٹلی والا:۔ (وقفہ) عورتوں اور موتیوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

شیریں:۔ اس لئے کہ موتیوں کا ہار پر دیا جا سکتا ہے۔ عورتوں کا نہیں۔

باٹلی والا:۔ (ہنستا ہے) ..... خوب کہا ——— اچھا میں ابھی آتا ہوں ——— یہ ہار اسے دکھا دوں۔

شیریں:۔ جاؤ۔

باٹلی والا ہار لے کر باہر چلا جاتا ہے۔ شیریں جمائی لے کر اٹھتی ہے۔ اور پھر پلنگ پر لیٹ جاتی ہے۔

تیسرا منظر

وہی ڈرائنگ روم جو ہم پہلے منظر میں دکھا چکے ہیں۔ لالہ جگن ناتھ جوہری اٹھ کر ایک تصویر دیکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے گو اس طرح وقت کاٹنا چاہتا ہے کہ اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے

اور باٹلی والا ہار لے کر اندر داخل ہوتا ہے۔

باٹلی والا: معاف فرمایئے گا لالہ جگن ناتھ صاحب — مجھے بہت دیر ہوگئی —

جگن ناتھ: جی ہاں کافی دیر ہوگئی — مگر خیر — آپ ہار تو لے آئے؟

باٹلی والا: جی ہاں لے آیا۔ دیکھئے۔

(جگن ناتھ کی ہتھیلی پر ہار رکھ دیتا ہے — جگن ناتھ بغور دیکھتا ہے)

باٹلی والا: مجھے دیر اس لئے ہوگئی کہ میری بیوی نے اسے خدا معلوم کہاں رکھ چھوڑا تھا۔ بڑی تلاش کے بعد ملا — اسے زیوروں سے بالکل دلچسپی نہیں۔

جگن ناتھ: اس ہار سے بھی نہیں! — مسٹر باٹلی والا۔ یہ تو بہت ہی قیمتی چیز ہے

باٹلی والا: جی مجھے معلوم ہے۔

جگن ناتھ: بہت ہی عمدہ موتی ہیں۔

باٹلی والا: اچھے ہی تھے تو میں نے یہ ہار ایک بہت بڑی قیمت پہ خریدا۔

جگن ناتھ: بے شک ہے — آپ نے کم از کم — کم از کم —

ساٹھ ہزار سے آپ نے کیا کم دیئے ہوں گے؟

باٹلی والا:۔ کم تو نہیں اس سے زیادہ دیئے تھے۔

جگن ناتھ:۔ تو آپ اسے بیچنا چاہتے ہیں؟

باٹلی والا:۔ مجھے روپے کی جیسا کہ آپ جانتے ہیں کوئی ضرورت نہیں۔
لیکن اگر اچھی قیمت مل جائے تو میں اسے بیچ دوں گا ——— میری
بیوی سے کسی روز ایسے ہی کھو جائے گا ——— دراصل وہ اس ہار
کو منحوس بھی سمجھتی ہے۔

جگن ناتھ۔ کوئی خاص بات ہے؟

باٹلی والا:۔ کوئی بھی نہیں ——— عورتوں کے دماغ میں وہم پیدا ہوتے
دیر ہی کیا لگتی ہے۔

جگن ناتھ:۔ درست فرمایا آپ نے ——— تو آپ اسے بیچ ڈالنا چاہتے ہیں
(دونوں صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

باٹلی والا:۔ اگر کوئی اچھا گاہک مل جائے۔

جگن ناتھ:۔ میں بھولا کرنل امر ناتھ۔

باٹلی والا:۔ جی نہیں۔ میں کرنل امر ناتھ کو نہیں جانتا۔

جگن ناتھ:۔ ابھی حال ہی میں ریٹائر ہو کر آئے ہیں۔ پہلے سورت میں پریکٹس
کیا کرتے تھے۔

باٹلی والا:۔ سورت میں ——— میں سورت کا رہنے والا نہیں۔ وہاں کی میری بیوی ہے ——— ہاں تو یہ کرنل امرناتھ۔ ....

جگن ناتھ:۔ میرے بہت پرانے گاہک ہیں۔ شاید وہ یہ ہار لینا پسند کر لیں۔

باٹلی والا:۔ آدمی کیسا ہے؟

جگن ناتھ:۔ بے حد شریف آدمی ہیں ——— ابھی تو جوان ہیں۔ نامعلوم کیسے ریٹائر ہو کر یہاں چلے آئے ہیں؟

باٹلی والا:۔ تو یہ کرنل صاحب ہار لے ہی لیں گے؟

جگن ناتھ:۔ میرا خیال ہے۔

باٹلی والا:۔ تو آپ ان سے بات چیت کیجئے ——— مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔

جگن ناتھ:۔ بہت بہتر

باٹلی والا:۔ جب آپ نے کہا ہے کہ آدمی شریف ہے تو ایسا کریں کہ اسے بلوا لیں۔ آج ہی رات دعوت کر دیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے اگر ایسا ہو سکے ——— اگر وہ یہاں آنا چاہے ——— تھوڑی دیر باتیں بھی رہیں گی۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

جگن ناتھ:۔ عجیب ہے وہ کل ہی آپ کا ذکر کر رہے تھے۔

باٹلی والا: کس سلسلے میں ؟

جگن ناتھ: مجھے یاد نہیں رہا۔ لیکن ایسے ہی باتوں باتوں میں آپ کا ذکر آگیا تھا میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ انہیں جانتے ہوں گے۔ کیوں جس طرح انہوں نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اور آپ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

باٹلی والا: خیر پہلے نہیں جانتے تھے تو اب جان لیں گے۔ آپ انہیں میری طرف سے دعوت دے دیجیئے گا۔ کہئے گا کہ مسٹر اور مسز باٹلی والا آپ سے مل کر خوش ہوں گے ـــــ اگر موقع ملا تو ہار کی بات وہیں ڈن ہوجائے گی۔ آپ کی کمیشن تو ہر وقت کھری ہے

جگن ناتھ: تو میں اب جاتا ہوں ـــ یہ لیجئے ہار۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں باٹلی والا ہار لے لیتا ہے۔

باٹلی والا: آپ بھی تشریف لائیے گا ـــ یعنی اگر کرنل امرناتھ ہماری دعوت قبول کرلیں تو آپ بھی ساتھ تشریف لائیے گا۔

جگن ناتھ: بہت بہتر میں حاضر ہوجاؤں گا۔

باٹلی والا: جی نہیں آپ کا آنا بہت ضروری ہے ـــــ آپ کو آنا ہی پڑیگا

جگن ناتھ: اگر انہوں نے دعوت قبول کرلی تو میں آپ کو فون کردوں گا۔

باٹلی والا: جی ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔

جگن ناتھ:۔ اچھا تو آداب عرض ہے۔

باٹلی والا:۔ آداب عرض ہے۔

جگن ناتھ جوہری چلا جاتا ہے۔ دوسرے دروازے سے خود باٹلی والا ہار کو ہاتھوں میں اچھالتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

چوتھا منظر

(شیریں کا کمرہ خواب اب شیریں نیا لباس پہن کر آئینے کے سامنے کھڑی ہے۔ اور بڑی بے دلی سے اپنے بال سنوار رہی ہے۔ اس کا شوہر ہاتھوں میں اسی طرح ہار اچھالتا اندر آتا ہے اور شیریں کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔ شیریں اس کا عکس آئینے میں دیکھتی ہے)

شیریں:۔ ہار دیکھ لیا تمہارے دوست نے؟

باٹلی والا:۔ ہاں دیکھ لیا اور میری امید کے مطابق بہت پسند کیا گیا اگر ہم اسے بیچنا چاہیں تو ساٹھ ستر ہزار کا بڑی آسانی کے ساتھ مل سکتے ہیں۔

شیریں:۔ بیچ دو۔

باٹلی والا:۔ بیچ کے کیا کروں گا ——— تم بیچ ڈالو۔

شیریں: ہار ہے۔

باٹلی والا:۔ اچھا تو سنبھالو —

شیریں:۔ رکھ دو اس میز پہ۔

باٹلی والا:۔ (سنگھار میز پہ ہار رکھ دیتا ہے اور آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) تم آج کل اتنی اداس کیوں رہتی ہو؟

شیریں:۔ (مڑکر) اب پھر وہی باتیں نہ شروع کرو — میں اداس ضرور ہوں پر یہ باتیں اور بھی زیادہ اداس ہیں۔

باٹلی والا:۔ تمہاری تفریح کے لئے آج میں نے دو دوستوں کو ڈنر پہ بلایا ہے —

شیریں:۔ (سنگھار میز کے پاس سے ہٹ کر پلنگ کی طرف جاتے ہوئے) یہ دوست کون ہیں؟

باٹلی والا:۔ ایک تو یہی ہوں گے جو ابھی آئے تھے۔ دوسرے ان کے دوست ہیں۔ ان کو میں جانتا — تمہارا ہار دیکھیں گے۔ جگن ناتھ کہتا تھا کہ وہ موتیوں کے عاشق ہیں — موتیوں کو کون پسند نہیں کرتا۔ ایک صرف تم ہو جو — — —

شیریں:۔ کیا میرا دعوت میں شامل ہونا ضروری ہے؟

باٹلی والا:۔ ضروری تو نہیں۔ تمہارا جی بہل جائے گا۔ ذرا اِدھر اُدھر کی باتیں کریں گے۔ جگن ناتھ موتیوں کے قصے سنائے گا اور اس کا دوست

جو کہ ڈاکٹر ہے اور ابھی ابھی جنگ کے میدان سے آیا ہے مریضوں
کی داستانیں سنائے گا۔
تم اس سے اپنے سر درد کی دوا بھی پوچھ لینا۔
شیریں:۔ تمہیں میری اتنی فکر نہیں کرنی چاہیئے
باٹلی والا:۔ (ہنستا ہے) بہت بہتر — میں یہاں سے چلا جاتا ہوں ؟
شیریں:۔ نہیں بیٹھو۔ لیکن ایسی باتیں شروع نہ کرو جس سے ... خیر
یہ ڈاکٹر کون ہیں ؟
(پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے)
باٹلی والا:۔ میں نہیں جانتا — اگر انھوں نے دعوت قبول کر لی تو آج
شام کو پتہ لگ جائے گا .... (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)
باٹلی والا:۔ دیکھنا کون ہے — میرا خیال ہے جگن ناتھ ہو گا۔
شیریں:۔ یہی جو ابھی آئے تھے۔
باٹلی والا:۔ ہاں یہی — دیکھو تو۔
شیریں:۔ (اٹھ کر تپائی پر سے ٹیلیفون کا چونگا اٹھاتی ہے) .... ہلو
— مسز باٹلی والا اسپیکنگ — گڈ ایوننگ — جی ہاں
میرے پاس ہی بیٹھے ہیں — بہت بہتر — شکریہ —
(ٹیلیفون کا چونگا رکھ دیتی ہے)

باٹلی والا:۔ جگن ناتھ ہی تھا

شیریں:۔ وہی تھا ـــــ آپ کی دعوت قبول کر لی گئی ہے ـــــ نو بجے یہ لوگ پہنچ جائیں گے۔

ایکٹ دوسرا

رات کا وقت، وہی ڈرائنگ روم جو ہم پہلے منظر میں دکھا چکے ہیں۔ پردہ اٹھتا ہے۔ گھڑیاں نو بجاتی ہیں۔ باٹلی والا کرنل امرناتھ اور جگن ناتھ تینوں کھڑے نظر آتے ہیں۔

باٹلی والا:۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی کرنل امرناتھ۔

امرناتھ:۔ آپ سے زیادہ مجھے ہوئی۔

باٹلی والا:۔ ہاتھ نہیں ملائیں گے آپ۔

امرناتھ:۔ (ہنس کر) اتنے تکلفات کی کیا ضرورت ہے ـــــ اس کے علاوہ ہاتھ ملانا کچھ مناسب نہیں سمجھتا۔ آپ برا نہ مانئے گا۔ طبی نقطہ نگاہ سے ہاتھ ملانا ٹھیک نہیں۔

باٹلی والا:۔ (ہنستا ہے) نہ جانے کیا کیا نقطے اور پیدا کئے جائیں گے۔ بہر حال آپ کی ہر بات ماننی پڑے گی۔

امرناتھ:۔ (ہنستا ہے) ڈاکٹروں کی ہر بات مان لی جائے تو آدھی بیماریاں کم ہو جائیں۔

باٹلی والا:۔ جگن ناتھ صاحب آپ خاموش کیوں ہیں ــــ بتائیے کیا آپ کرنل صاحب کی ہر بات مان لیا کرتے ہیں؟

جگن ناتھ:۔ میں نے آج تک ان کی کوئی بات نہیں مانی۔

باٹلی والا:۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو ہمیشہ زکام کی شکایت رہتی ہے۔

(امرناتھ، جگن ناتھ اور باٹلی والا تینوں ہیں اور صوفوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

باٹلی والا:۔ (توقف کے بعد) کرنل امرناتھ میں بہت ممنون ہوں کہ آپ غریب خانے پر بغیر کسی تعارف کے تشریف لے آئے۔

امرناتھ:۔ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ ممنون مجھے ہونا چاہئے۔

باٹلی والا:۔ کرنل امرناتھ میں آپ سے ایک بات پوچھوں۔ آپ اپنا ہاتھ جیب میں کیوں رکھتے ہیں۔ کیا اس میں بھی کوئی خاص نقطہ ہے۔

امرناتھ:۔ (ہنس کر) جی نہیں ــــ عادت سی پڑ گئی ہے۔

باٹلی والا:۔ آدمی عجیب عادت اختیار کر لیتا ہے۔ شیریں اندر داخل ہوتی ہے۔ سیاہ لباس میں) لیجئے شیریں بھی آ گئی ــــ شیریں آؤ ــــ کرنل امرناتھ سے ملو۔

شیریں:۔ (چونک کر) کرنل امرناتھ۔۔ ۔۔۔۔

(امرناتھ اُٹھ کر شیریں کی طرف دیکھتا ہے اور گھبرا جاتا ہے)

امرناتھ:۔ میں —— میں!

باٹلی والا:۔ کرنل امرناتھ یہ میری بیوی ہے۔

امرناتھ:۔ ب —— ب۔ بہت خوشی حاصل ہوئی۔

باٹلی والا:۔ شیریں یہ کرنل امرناتھ ہیں۔

شیریں:۔ آپ تشریف رکھئے —— میں یہاں بیٹھ جاؤں گی۔

(کرنل امرناتھ اپنی جگہ پہ بیٹھ جاتا ہے۔ شیریں ایک کرسی آگے کر کے اس پہ بیٹھ جاتی ہے۔)

جگن ناتھ:۔ معلوم ہوتا ہے مسز باٹلی والا سے آپ کی پہلے ملاقات ہو چکی ہے۔

شیریں:۔ جی ہاں یہ سورت میں پریکٹس کیا کرتے تھے۔

باٹلی والا:۔ تو —— تو —— آپ نے مجھے کبھی دیکھا ہوگا؟ ممکن ہے کبھی ملاقات بھی ہوئی ہو۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ کبھی شیریں نے آپ سے طبی مشورہ بھی لیا ہو۔

امرناتھ:۔ جی ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔

باٹلی والا:۔ (اچانک جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہے) میں ابھی حاضر ہوا ——

ایک ضروری ٹیلیفون کرنا ہے۔

(باہر چلا جاتا ہے)

جگن ناتھ:۔ کرنل امرناتھ۔ آپ نے مسز باٹلی والا کا ہار دیکھا؟

امرناتھ:۔ جی ہاں دیکھا ہے۔ سب سے پہلے میری نظر اسی پر پڑی تھی۔

شیریں:۔ آپ دیکھئے گا۔

امرناتھ:۔ آپ کو اعتراض نہ ہو۔

شیریں:۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ شوق سے دیکھئے ---- یہ

---- یہ لیجئے ---- (گلے سے ہار اتار کر امرناتھ کو دیتی ہے)

امرناتھ:۔ شکریہ ---- بہت اچھا ہار ہے ---- ہر ایک موتی اپنی جگہ ----

ہیں یہ کیا ہوا؟ (ایک دم لائٹ اوف ہو جاتی ہے بالکل اندھیرا

چھا جاتا ہے۔)

جگن ناتھ:۔ لائٹ اوف ہو گئی۔

شیریں:۔ (گھبرا کر) ..... یہ کیا ہو؟

امرناتھ:۔ کچھ نہیں ..... ابھی روشنی ہو جائے گی۔

شیریں:۔ امرناتھ۔

جگن ناتھ:۔ مسز باٹلی والا ---- مسٹر باٹلی والا کہاں گئے؟

ایک دم شیریں کے چیخنے کی آواز ---- دو آدمیوں کی باہمی کشمکش

—شیریں اور زیادہ زور سے چیختی ہے۔ مگر یہ چیخ اس کے حلق ہی میں دبا دی جاتی ہے — گلا گھونٹا جاتا ہے — گلا گھونٹا جاتا ہے شیریں سانس لینے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر اسے سانس نہیں آتا۔

—اس دوران میں جگن ناتھ پاگلوں کی طرح چیختا رہتا ہے "مسٹر باٹلی والا — مسٹر باٹلی والا — یہ کیا ہو رہا ہے؟ کوئی ہے — کوئی ہے — شیریں کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر اس کی آواز اس کے گلے ہی میں دبا دی جاتی ہے۔ پھر ایک دم روشنی ہوتی ہے۔ قالین پہ شیریں کی لاش پڑی دکھائی دیتی ہے۔

جگن ناتھ:۔ روشنی ہو گئی — مہ — مہ — مگر یہ کیا ہے — مسٹر باٹلی والا — مسز باٹلی بے ہوش پڑی ہیں۔ کرنل امرناتھ — کرنل امرناتھ۔

(ایک لمحہ کے لئے مکمل سکوت)

جگن ناتھ:۔ (زور سے) کرنل امرناتھ۔

(قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ پھر سامنے کے دروازے سے باٹلی والا اندر داخل ہوتا ہے)

جگن ناتھ:۔ کون ہے؟

باٹلی والا:۔ میں ہوں — کیوں — ارے یہ کیا ہوا (دوڑ کر شیریں

کی لاش کے پاس جاتا ہے) ــ شیریں ــــ شیریں ــ
جگن ناتھ صاحب یہ کیا معاملہ ہے ؟
جگن ناتھ (لرزاں آواز میں) مجھے ـــ مجھے کچھ معلوم نہیں ۔
باٹلی والا: شیریں ـــ شیریں ـــ (آواز بھر آجاتی ہے) شیریں ـــ اس کا گلا کس نے گھونٹا ہے ؟ ـــ جگن ناتھ صاحب آپ دیکھ رہے ہیں یہ نشان گردن پر ـــ دس انگلیوں کے نشان صاف طور پر نظر آرہے ہیں ـــ کرنل امرناتھ کہاں ہیں ؟ (قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ باٹلی والا اٹھ کھڑا ہوتا ہے ـــ سامنے کے دروازے سے کرنل امرناتھ اندر آتا ہے)

امرناتھ: فرمایئے ۔
جگن ناتھ: آپ کہاں چلے گئے تھے ـــ آپ نے ـــ آپ نے دیکھا یہ کیا ہوگیا ہے ؟
امرناتھ: (سنجیدگی کے ساتھ) میں ٹیلی فون کرنے گیا تھا۔
باٹلی والا: ٹیلیفون ؟
امرناتھ: جی ہاں۔ پولیس اسٹیشن ٹیلیفون کرنا تھا۔
(سنتو پاگلوں کی طرح دوڑتا اندر آتا ہے)
سنتو: سرکار ـــ سرکار ـــ

باٹلی والا: کیا ہے؟

سنتو: تھانے سے کچھ آدمی آئے ہیں۔

باٹلی والا: انہیں اندر بھیج دو۔

(سنتو باہر چلا جاتا ہے۔)

باٹلی والا: ہار؟ — ہار کہاں ہے؟ — شیریں نے ہار پہنا ہوا تھا۔

جگن ناتھ: کرنل صاحب آپ نے لیا تھا۔

امرناتھ: میں نے — ہار لیا تھا پر جب بجلی گل ہوئی تھی تو یہیں گر پڑا تھا — ٹھہریئے میں ڈھونڈتا ہوں۔

باٹلی والا: کرنل امرناتھ آپ کی پوزیشن بہت نازک ہو گئی ہے — شیریں کو قتل کیا گیا ہے اور ہار غائب ہے۔

امرناتھ: آپ کا مطلب۔

باٹلی والا: میرا مطلب واضح ہے — پولیس اسٹیشن کو ٹیلیفون بھی آپ ہی نے کیا ہے — (انسپکٹر پولیس اور چند سپاہی اندر داخل ہوتے ہیں)

پولیس انسپکٹر: یہاں سے ٹیلیفون کس نے کیا تھا؟

امرناتھ: میں نے۔

انسپکٹر: کیا ہوا ہے؟

باٹلی والا:۔ دیکھ لیجئے ۔۔ میری بیوی کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے اور ہار غائب ہے۔

انسپکٹر:۔ یہاں سے کوئی آدمی باہر تو نہیں گیا؟

باٹلی والا:۔ جی نہیں ۔۔ کرنل امرناتھ میری بیوی کا ہار دیکھنے آئے تھے لالہ جگن ناتھ جوہری کے ساتھ (جگن ناتھ کی طرف اشارہ کر کے

انسپکٹر:۔ پھر کیا ہوا؟

جگن ناتھ:۔ مسٹر باٹلی کہیں ٹیلیفون کرنے باہر گئے ۔۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دم بجلی اوف ہو گئی اور کسی نے مسز باٹلی والا کا گلا گھونٹ دیا۔ اس قدر اندھیرا تھا کہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ صرف آوازیں آتی تھیں۔۔۔

انسپکٹر:۔ کرنل امرناتھ کہاں تھے؟

امرناتھ:۔ بجلی گل ہوتی ہی میں کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

انسپکٹر:۔ کیوں۔

امرناتھ:۔ آپ کو ٹیلیفون کرنے کے لئے۔

انسپکٹر:۔ آپ نے مسز باٹلی والا کا ہار دیکھا؟

امرناتھ:۔ جی ہاں۔ انھوں نے اپنے گلے سے اتار کر دیا۔ مگر جب بجلی اوف ہوئی اور میں دوڑ کر باہر نکلا تو وہ یہیں گر گیا۔ تلاش کرنے پر

باٹلی والا:۔ اگر وہ یہاں گرا ہوتا تو نظر آجاتا۔

امرناتھ:۔ انسپکٹر صاحب — میری طبیعت خراب ہے۔ نوازش ہوگی
اگر آپ مجھے یہاں سے گھر جانے کی اجازت دے دیں۔

انسپکٹر:۔ کرنل امرناتھ آپ زیر حراست ہیں

امرناتھ:۔ زیر حراست ؟

انسپکٹر:۔ جی ہاں — آپ دوسرے کمرے میں گئے تھے — دیکھو
جمال دین تم دوسرے کمرے میں جاکر ہار تلاش کرو۔

جمال دین:۔ بہت بہتر جناب۔

(باہر چلا جاتا ہے)

امرناتھ:۔ تو آپ کو مجھ پر شک ہے؟

انسپکٹر:۔ مجھے ہر ایک پر شک ہے۔

جگن ناتھ:۔ (گھبراکر) مگر — مگر میں تو بالکل نردوش تھا۔

انسپکٹر:۔ تو آپ کی بیوی کا گلا گھونٹا گیا ہے (لاش کے پاس جاکر غور
سے گردن کے نشانات دیکھتا ہے) ...... ہاں گلا ہی گھونٹا
گیا ہے اور بہت ظالمانہ طور پر گھونٹا گیا ہے۔ دس انگلیوں کے
نشان گردن پر صاف نظر آرہے ہیں — کرنل امرناتھ کو آپ اچھی طرح
جانتے ہیں۔

باٹلی والا :۔ جی نہیں آج ہی میرے گھر آئے ہیں۔ ہار دیکھنے کے لئے۔

انسپکٹر :۔ آپ کی بیوی کو جانتے تھے ؟

امرناتھ :۔ ایک دوبار سرسری ملاقات سورت میں ہوئی تھی۔

انسپکٹر :۔ ٹھیک !

(جمال دین سپاہی ہار اور ایک اوورکوٹ لئے اندر خوش خوش داخل ہوتا ہے)

جمال دین : انسپکٹر صاحب ہار مل گیا۔

امرناتھ :۔ لیجئے صاحب ہار مل گیا۔

انسپکٹر :۔ کہاں سے ملا ؟

جمال دین :۔ اس اوورکوٹ کی اندرونی جیب سے۔

انسپکٹر :۔ یہ کوٹ کس کا ہے ؟

امرناتھ :۔ میرا ہے — مگر یہ ہار میں نے اس میں نہیں رکھا۔

انسپکٹر :۔ کرنل صاحب اب معاملہ بالکل صاف ہے — میں آپ کو مسز باٹلی والا کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔

امرناتھ :۔ میں نے خیبرین کو قتل نہیں کیا — آپ — آپ غلط کہتے ہیں

انسپکٹر :۔ میں غلط کہتا ہوں لیکن مرحومہ کی گردن غلط نہیں کہتی۔ اس پر آپ کے دونوں ہاتھ نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گئے ہیں۔

امرناتھ:۔ تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے شیریں کا گلا گھونٹا ہے؟

انسپکٹر:۔ جی ہاں۔

امرناتھ:۔ اور یہ دس انگلیوں کے نشان جو بیچاری شیریں کی گردن پہ نظر آرہے ہیں میرے ہیں؟

انسپکٹر:۔ جی ہاں۔

امرناتھ:۔ تو آپ کو بہت بھول ہوئی ہے۔

انسپکٹر:۔ کیسے؟

امرناتھ:۔ اِدھر دیکھئے . . . . (کوٹ میں سے ہاتھ باہر نکالتا ہے) . . آپ میرا یہ ہاتھ دیکھ رہے ہیں — یہ داہنا ہاتھ — ایک۔ دو۔ تین — اس میں تین انگلیاں نہیں ہیں — ایک پریشن میں تین انگلیاں کٹوا کر مجھے جنگ کے میدان میں یہاں آنا پڑا ہے۔

سناٹا چھا جاتا ہے۔

انسپکٹر:۔ تین انگلیاں — ہاں سچ مچ تین انگلیاں غائب ہیں تو پھر مسٹر باٹلی والا کو قتل کس نے کیا ہے؟

امرناتھ:۔ آپ مسٹر باٹلی والا کو اپنی بیوی شیریں کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیجئے — عدالت میں سارا واقعہ میں بیان کر دوں گا۔ سورت میں بھی انہوں نے ایک دفعہ اس غریب کو زہر دے کر

ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر میں نے بچا لیا تھا ۔۔ افسوس ہے کہ اس مرتبہ باوجود کوشش کے اس کو نہ بچا سکا۔

(شیریں کی لاش کی طرف دیکھتا ہے۔ اور فرطِ غم سے منہ موڑ لیتا ہے)

باٹلی والا: یہ جھوٹ ہے ۔۔ (کانپتی آواز میں) ۔۔ یہ جھوٹ ہے۔

انسپکٹر: بھاگنے کی کوشش نہ کیجئے ۔۔ سپاہی مکان کے باہر کھڑے ہیں۔ انسپکٹر باٹلی والا کو پکڑ کر ہتھکڑی پہنا دیتا ہے۔

پردہ

مس فریا

شادی کے ایک مہینے بعد سہیل پریشان ہو گیا۔ اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا۔

اس کا خیال تھا کہ بچہ کم از کم تین سال کے بعد پیدا ہو گا۔ مگر اب ایک دم یہ معلوم کر کے اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ جس بچے کا اس کو وہم و گمان بھی نہیں تھا اس کی بنیاد رکھی جا چکی ہے اس کی بیوی کو بھی اتنی جلدی ماں بننے کا شوق نہیں تھا اور سچ پوچھیے تو وہ ابھی خود بچہ تھی چودہ پندرہ برس کی عمر کیا ہوتی ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے آنشہ گڑیاں کھیلتی تھی۔ اور صرف پانچ مہینے کی بات ہے کہ سہیل نے اسے گلی جنگلی بلی کی طرح نکمے چنوں پر خوانچے والے سے لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ منہ لال کیے وہ اس سے کہہ رہی تھی "تم نے مجھے کل بھی کھیلیں اسی طرح

کم کردی تھیں۔ تم بے ایمان ہو ––– میرے پیسے کیا مفت کے آتے ہیں جو میں تول میں ہر بار کم چیز لے لوں "۔ اور ساس نے زبردستی جھپٹا مار کر مٹھی بھر نمکین چنے اس کے خوانچے سے اٹھا لئے تھے۔

اب سہیل یہ منظر یاد کرتا اور سوچتا کہ عائشہ کی گود میں بچہ ہوگا جب وہ گھر جاتے ہوئے ٹرین کا سفر کرے گی تو اپنے اس ننھے کو اسی طرح دودھ پلائے گی جس طرح ریل کے ڈبوں میں دوسری عورتیں پلایا کرتی ہیں ––– اس کی لڑکی یا لڑکا اسی طرح چیں چیں کرے گا اسی طرح ہونٹ سیکڑ کر رو دے گا تو وہ عائشہ سے کہے گا "بچہ رو رو کر ہلکان ہوا جا رہا ہے اور تم کھڑکی میں سے باہر کا تماشا دیکھ رہی ہو ––– " اس کا تصور کرتے ہی سہیل کا حلق سوکھ جاتا ہے۔

اس عمر میں بچہ؟ ––– کبھی میرا تو ستیاناس ہو جائے ––– ساری شاعری تباہ ہو جائے گی۔ وہ ماں بن جائے گی۔ میں باپ بن جاؤں گا۔ شادی کا باقی رہے گا کیا ––– صرف ایک مہینہ جس میں ہم دونوں میاں بیوی بن کے رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اولاد کا سلسلہ کیوں میاں بیوی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اولاد بری چیز ہے۔ بچے پیدا ہوں۔ پر اس وقت جب ان کی خواہش کی جائے یہ نہیں کہ بن بلائے مہمانوں کی طرح آن ٹپکیں۔ میں خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا۔ کیسے کیسے حسین خیال

میرے دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔ شروع شروع کے دن تو ایک
عجیب قسم کی افراتفری میں گذرے تھے۔ اب ایک مہینے کے بعد سب
چیزوں کی نوک پلک درست ہوئی تھی۔ اب شادی کا اصلی لطف آنے لگا
تھا کہ بیٹھے بٹھائے یہ آفت آگئی ۔۔۔ ابھی جانے کتنے اور رہتل ؟"

سہیل پریشان ہو گیا۔ اگر دفعۃً آسمان سے کوئی جہاز بم برسانا شروع
کر دیتا تو وہ اس قدر پریشان نہ ہوتا۔ مگر اس حادثے نے اس کا دماغی۔
ذہن درہم برہم کر دیا تھا۔ وہ اتنی جلدی باپ نہیں بننا چاہتا تھا۔

"میں اگر باپ بن جاؤں تو کوئی حرج نہیں مگر مصیبت یہ کہ عائشہ ماں
ن جائے گی ۔۔۔ اس کو اتنی جلدی ہرگز ہرگز ماں نہیں بننا چاہئے۔ وہ جولانی
ہاں رہے گی اس کی جس کو میں اب بھی شادی ہونے کے بعد کنکھیوں
سے دیکھتا ہوں۔ اور ایک لرزش سی اپنے خیالات میں محسوس کرتا ہوں
ں کی تیز و طراری کہاں رہے گی ۔۔۔ وہ بھولا پن جو اب مجھے عائشہ میں
ں نظر آتا ہے۔ ماں بن کر بالکل غائب ہو جائے گا۔ وہ کھلنڈرا پن جو اس کی
وں میں پھڑکتا ہے مردہ ہو جائے گا ۔۔۔ وہ ماں بن جائے گی اور صابن کے
ہاگ کی طرح اس کی تمام چلبلاہٹیں بیٹھ جائیں گی ۔۔۔ گود میں ایک چھوٹے
ے روتے بلتے کو لئے کبھی وہ میز پر پیپر ویٹ اٹھا کر بجائے گی کبھی کنڈی
ائے گی۔ اور کبھی کن سُری تانوں میں اوٹ پٹانگ لوریاں سنائے گی ۔۔۔

واللہ میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔"

سہیل کو دیوانگی کی حد تک اس حادثے نے پریشان کر رکھا تھا۔ تین چار دن تک اس کی پریشانی کا کسی کو علم نہ ہوا۔ مگر اس کے بعد جب اس کا چہرہ فکر و تردد کے باعث مرجھا سا گیا تو ایک دن اس کی ماں نے کہا۔"سہیل کیا بات ہے۔ آج کل تم بہت اداس رہتے ہو۔"

سہیل نے جواب دیا "کوئی بات نہیں امی جان ــ موسم ہی کچھ ایسا ہے"

موسم بے حد اچھا تھا۔ ہوائیں لطافت تھی۔ وکٹوریہ گارڈن میں جب وہ سیر کے لئے گیا تو اسے بے شمار پھول کھلے ہوئے نظر آئے تھے۔ ہر رنگ کے ہریاول بھی عام تھے۔ درختوں کے پتے اب مٹیالے نہیں تھے۔ ہر شے دھلی ہوئی نظر آتی تھی۔ مگر سہیل نے اپنی اداسی کا باعث موسم کی خرابی بتایا۔

ماں نے جب یہ بات سنی تو کہا "سہیل تو مجھ سے چھپاتا ہے ــ دیکھ سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے ــــ عائشہ نے تو کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔

سہیل کے جی میں آئی کہ اپنی ماں سے کہہ دے "ایسی ویسی بات؟ امی جان اس نے ایسی بات کی ہے کہ میری زندگی تباہ ہو گئی ہے ــــ مجھ سے پوچھے بغیر اس نے ماں بننے کا ارادہ کر لیا ہے"۔ مگر اس نے یہ بات نہ کہی اس لئے کہ یہ سن کر اس کی ماں یقینی طور پر خوش نہ ہو گی۔

نہیں امی جان عائشہ نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ وہ تو بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ آپ سے تو اسے بے پناہ محبت ہے ــــ دراصل میری میری اداسی کا باعث ــــ لیکن امی جان میں تو بہت خوش ہوں۔

یہ سن کر اس کی ماں نے دعائیہ لہجے میں کہا۔ "اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ عائشہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے ــ میں تو اسے بالکل اپنی بیٹی کی طرح سمجھتی ہوں ــ اچھا پر سہیل یہ تو بتا اب میرے دل کی مراد کب پوری ہو گی ــ"

سہیل نے مصنوعی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"تو سب سمجھتا ہے ــــ میں پوچھتی ہوں کب تیرا لڑکا میری گود میں کھیلے گا۔ سہیل دل کی آرزو تھی کہ تجھے دولہا بنتا دیکھوں۔ سو یہ آرزو خدا نے پوری کر دی۔ اب اس بات کی تمنا ہے کہ تجھے پھلتا پھولتا بھی دیکھوں۔"

سہیل نے اپنی ماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "امی جان! آپ تو ہر وقت ایسی ہی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ دو برس تک میں بالکل اولاد نہیں چاہتا۔"

"دو برس تک تو ــ بالکل اولاد نہیں چاہتا، کیسے؟ ــــ یعنی تو اگر نہیں چاہے گا تو بچی بچہ نہیں ہو گا۔؟ ــــ واہ ایسا بھلا کبھی ہو سکتا ہے۔

اولاد دینا نہ دینا اس کے ہاتھ میں ہے اور ضرور دے گا۔ اللہ کے حکم سے کل ہی میری گود میں پوتا کھیل رہا ہوگا۔

سہیل نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ کہتا بھی کیا۔ اگر وہ اپنی ماں کو بتا دیتا کہ عائشہ حاملہ ہو چکی ہے تو ظاہر ہے کہ سارا راز فاش ہو جاتا اور وہ بچے کی پیدائش روکنے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکتا۔ شروع میں اس نے سوچا تھا کہ شاید کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے شادی شدہ دوستوں سے سنا تھا کہ عورتوں کے حساب وکتاب میں کبھی کبھی الٹ پھیر ہو جایا کرتا ہے۔ ابھی تک یہ خیال اس کے دماغ میں جما ہوا تھا اس کے موہوم ہونے پر بھی اس کو امید تھی کہ چند ہی دنوں میں مطلع صاف ہو جائے گا۔

پندرہ بیس دن گذر گئے مگر مطلع صاف نہ ہوا۔ اب اس کی پریشانی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ وہ جب بھولی بھالی عائشہ کی طرف دیکھتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کسی مداری کے تھیلے کی طرف دیکھ رہا ہے"۔ آج عائشہ میرے سامنے کھڑی ہے کتنی اچھی لگتی ہے۔ لیکن مہینوں میں اس کا پیٹ پھول کر مٹکا سا بن جائے گا۔ ہاتھ پیر سوج جائیں گے۔ ہوا میں عجیب عجیب خوشبوئیں اور بدبوئیں سونگھتی پھرے گی۔ قے کرے گی اور خدا معلوم کیا سے کیا بن جائے گی!"

سہیل نے اپنی پریشانی ماں سے چھپائے رکھی، بہن کو بھی پتہ نہ چلنے دیا۔ مگر بیوی کو معلوم ہو ہی گیا۔ ایک روز سونے سے پہلے عائشہ نے بڑے تشویشناک لہجے میں اس سے کہا "کچھ دنوں سے آپ مجھے بے حد مضطرب نظر آتے ہیں ۔ کیا وجہ ہے ؟"

لطف یہ ہے کہ عائشہ کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک دوبار اس نے سہیل سے کہا تھا کہ اب کی دفعہ کیا ہو گیا ہے تو سہیل نے بات گول مول کر دی تھی اور کہا تھا کہ شادی کے بعد بہت ہی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسی ہی تبدیلی ہو گئی ہو۔ مگر اب اسے سچی بات بتانا ہی پڑے گی۔ "عائشہ میں اس لئے پریشان ہوں کہ تم ..... تم اب ماں بننے والی ہو۔"

عائشہ شرما گئی "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتا ہوں۔ اب جو حقیقت ہے میں تم سے کہہ دی ہے۔ تمہارے لئے یہ خوشخبری ہو گی مگر خدا کی قسم اس نے مجھے کئی دنوں سے پاگل بنا رکھا ہے۔"

عائشہ نے جب سہیل کو سنجیدہ دیکھا تو کہا "تو ..... تو ..... کیا سچ مچ ؟ ....."

ہاں ہاں ۔۔۔ سچ مچ ۔۔۔ تم ماں بننے والی ہو ۔۔۔ خدا کی قسم جب میں سوچتا ہوں کہ چند مہینوں ہی میں تم کچھ اور ہی بن جاؤ گی۔ تو

میرے دماغ میں ایک ہل چل سی مچ جاتی ہے ــــ میں نہیں چاہتا کہ اتنی جلدی بچہ پیدا ہو۔ اب خدا کے لئے تم کچھ کرو۔"

عائشہ یہ بات سن کر صرف مجوب سی ہو گئی تھی۔ حجاب کے علاوہ اس نے ہونے والے بچے کے متعلق کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ دراصل یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکتی تھی کہ اسے خوش ہونا چاہیئے۔ یا گھبراہٹ کا اظہار کرنا چاہیئے۔ اس کو معلوم تھا کہ جب شادی ہوئی ہے تو بچہ ضرور پیدا ہو گا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سہیل اتنا پریشان ہو جائے گا۔

سہیل نے اس کو خاموش دیکھ کر کہا۔ اب سوچتی کیا ہو۔ کچھ کرو تا کہ اس بچے کی مصیبت ٹلے۔"

عائشہ دل ہی دل میں ہونے والے بچے کے ننھے ننھے کپڑوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ سہیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

کیا کہا؟

"میں کہتا ہوں کچھ بندوبست کرو کہ بچہ پیدا نہ ہو۔"

"بتایئے میں کیا کروں؟"

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تم سے کیوں کہتا۔ تم عورت ہو۔ عورتوں سے ملتی رہی ہو۔ شادی پہ تمہاری بیاہی ہوئی سہیلیوں نے تمہیں کئی مشورے دیئے ہوں گے یاد کرو۔ کسی سے پوچھو۔ کوئی نہ کوئی ترکیب تو ضرور

ہو گی ـــ"

عائشہ نے اپنے حافظہ پر زور دیا۔ مگر اسے کوئی ایسی ترکیب یاد نہ آئی مجھے تو آج تک کسی نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ پر میں پوچھتی ہوں کہ اتنے دن آپ نے مجھ سے کیوں نہ کہا جب بھی میں نے آپ سے اس بارے میں بات چیت کی آپ نے ٹال دیا۔"

میں نے تمہیں پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ بھی سوچتا رہا کہ شاید میرا واہمہ ہو۔ پر اب کے بات بالکل پکی ہو گئی ہے۔ تمہیں بتانا ہی پڑا۔ عائشہ اگر اس کا کوئی علاج نہ ہوا تو خدا کی قسم بہت ہی آفت آجائے گی۔ آدمی شادی کرتا ہے کہ چند برس ہنسی خوشی گذار دے۔ یہ نہیں کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں۔ جھٹ سے ایک بچہ پیدا ہو جائے ـــــ کسی ڈاکٹر سے مشورہ لیتا ہوں۔"

عائشہ نے جواب دماغی طور پر سہیل کی پریشانی میں شریک ہو چکی تھی کہا ہاں۔ کسی ڈاکٹر سے ضرور مشورہ لینا چاہیئے۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ بچہ اتنی جلدی نہ ہو۔"

سہیل نے سوچنا شروع کیا۔ پولینڈ کا ایک ڈاکٹر اس کا واقف تھا۔ پچھلے دنوں جب شراب کی بندش ہوئی تھی تو وہ اس ڈاکٹر کے ذریعہ ہی سے وسکی حاصل کرتا تھا۔ پر اب وہ دیوالی میں نظر بند تھا۔ کیوں کہ حکومت

کو اس کی حرکات و سکنات پر شبہ ہو گیا تھا۔ یہ ڈاکٹر نظر بند نہ ہوتا تو یقیناً سہیل کا کام کر دیتا۔ اس پرتگالی ڈاکٹر کے علاوہ ایک یہودی ڈاکٹر کو بھی وہ جانتا تھا۔ جس سے اس نے اپنی چھاتی کے درد کا علاج کرایا تھا۔ سہیل اس کے پاس چلا جاتا مگر اس کا چہرہ اتنا رعب دار تھا کہ وہ اس سے ایسی بات کے متعلق ارادے کے باوجود مشورہ نہ لے سکتا۔

یوں تو بمبئی میں ہزاروں ڈاکٹر موجود تھے مگر بغیر واقفیت اس معاملے کے متعلق بات چیت ناممکن تھی ۔۔۔ بہت دیر تک غور و فکر کرنے کے بعد معاً اس کو مس فریا کا خیال آیا جو ناگپاڑے میں پریکٹس کرتی تھی۔ اور اس کا خیال آتے ہی مس فریا اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔

موٹے اور بھاری جسم کی یہ کرسچین عورت عجیب و غریب کپڑے پہنتی تھی۔ ناگپاڑے میں کئی یہودی کرسچین اور پارسی لڑکیاں رہتی ہیں۔ سہیل نے ان کو ہمیشہ چست اور شوخ رنگ لباسوں میں دیکھا۔ سکرٹ گھٹنوں سے ذرا نیچی، ننگی پنڈلیاں۔ اونچی ایڑی کی سینڈل۔ سر کے بال کٹے ہوئے۔ ان میں لہریں پیدا کرنے کے نئے نئے طریقے۔ ہونٹوں پر گاڑھی سرخی۔ گالوں پر اڑے اڑے رنگ کا غازہ بھویں مونڈ کر پتلی بنائی ہوئی۔ ان لڑکیوں کا بناؤ سنگھار کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ لگتا ہے ان چیزوں کو پہلے دیکھتی تھیں۔ جن سے عورت بنتی ہے۔ مگر مس فریا ٹخنوں تک لمبا ڈھیلا ڈھالا فراک پہنتی تھی۔ پنڈلیاں

ہمیشہ موٹی جرابوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ شو ہنی تھی بہت ہی پرانے فیشن کے بال کٹے ہوتے تھے۔ مگر ان میں لہریں پیدا کرنے کی طرف وہ کبھی توجہ ہی نہیں دیتی تھی۔ اس بے توجہی کے باعث اس کے بالوں میں ایک عجیب قسم کی بے جانی اور خشکی پیدا ہو گئی تھی۔ رنگ کالا تھا جو کبھی کبھی سانولا ہٹ بھی اختیار کر لیتا تھا۔

عائشہ نے تھوڑی دیر بچے کی پیدائش کے متعلق غور کیا اور سہیل کے پہلو میں سو گئی۔ غور و فکر ہمیشہ اس کو سلا دیا کرتا تھا۔

عائشہ سو گئی۔ مگر سہیل جاگتا رہا اور مس فریا کے متعلق سوچتا رہا۔

ٹھیک ایک برس پہلے انہی دنوں میں جب اس کے کمرے میں نہ یہ نیا پلنگ تھا جو عائشہ جہیز میں لائی تھی اور نہ خود عائشہ تھی تو سہیل نے ایک بار مس فریا کو خاص زاویے سے دیکھا تھا۔ سہیل کی بہن کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بچہ کب پیدا ہوگا مس فریا کو بلایا گیا تھا۔ سہیل تازہ تازہ بمبئی آیا تھا۔ ناپیا ڑے کی شوخ تیتریاں دیکھ دیکھ کر جو بالکل اس کے پاس سے پھڑپھڑاتی ہوئی گذر جاتی تھیں، اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ان سب کو پکڑ کر اپنی جیب میں رکھ لے مگر جب یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ نا امیدی کی حد تک پہنچ گیا تو اسے مس فریا دکھائی دی۔

پہلی نظر میں سہیل کے جمالیاتی ذوق کو صدمہ سا پہنچا ــــ کیسی بے ڈول عورت ہے ــــ لباس کیسا بے ہودہ ہے اور قد . . . تھوڑے ہی دنوں میں بھینس بن جائے گی۔"

مس فریا نے اس سوز کا رنگ کی جالی دار ٹوپی پہن رکھی تھی جس میں تین چار شوخ رنگ کے پھندنے لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کیچڑ بلیں آموجے گر پڑے ہیں۔ فراک جو ٹخنوں تک لٹکنے سے اداس انداز میں لٹک رہا تھا چھپی ہوئی جارجٹ کا تھا۔ پھول خوشنما تھے۔ کپڑا بھی اچھا تھا مگر بہت ہی بھونڈے طریقے پر سیا گیا تھا۔

مس فریا جب دوسرے کمرے سے فارغ ہوکر آئی تو اس نے سہیل سے انگریزی میں کہا ــــ "غسل خانہ کدھر ہے مجھے ہاتھ دھولینے ہیں۔"

غسل خانے میں سہیل نے مس فریا کو بہت ہی قریب سے دیکھا تو اسے نسوانیت کے کئی نقشے اس کے ساتھ چمٹے ہوئے نظر آئے۔ سہیل نے اب اسے پسند کرنے کی نیت سے دیکھنا شروع کیا۔ "بری نہیں ــــ آنکھیں خوبصورت ہیں۔ میک اپ نہیں کرتی تو کیا ہوا۔ ٹھیک ہے ہاتھ کیسے اچھے ہیں۔"

مس فریا کے بالائی ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ کام کرنے کے باعث پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ سہیل نے جب ان کی

طرف دیکھا تو مس فریا اسے پسند آگئی۔ پسینے کی یہ پھوار سی جو اس کی مونچھوں کی روئیں پر کپکپا رہی تھی۔ اسے بہت ہی بھلی معلوم ہوئی۔ سہیل کے جی میں آیا کہ وہ کچھ کرنا شروع کر دے۔ جس سے اس کا سارا جسم عرق آلود ہو جائے۔

مس فریا جب ہاتھ پونچھ کر فارغ ہو گئی تو اس نے سہیل کی ماں سے کہا "آپ ان کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے۔ میں دوا تیار کر کے دے دوں گی۔ اور استعمال کرنے کی ترکیب بھی سمجھا دوں گی۔"

تانگہ اڈے تک جہاں وہ پریکٹس کرتی تھی۔ وکٹوریہ میں سہیل نے اس سے کوئی خاص بات نہ کی۔ کونین کے متعلق اس نے چند باتیں دریافت کیں کہ ملیریا میں کتنی مقدار اس کی کھانی چاہئے۔ پھر اس نے دانتوں کی صفائی کے بارے میں اس سے کچھ معلومات حاصل کیں کہ اتنے میں وہ جگہ آ گئی جہاں مس فریا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا بورڈ لٹکا رہتا تھا۔

پہلی منزل کے ایک کمرے میں مس فریا کا مطب تھا۔ اس کمرے کے دو حصے کئے گئے تھے۔ ایک حصے میں مس فریا کی میز تھی جہاں وہ عام طور پر بیٹھتی تھی۔ دوسرے حصے میں اس کی ڈسپنسری تھی۔ ڈسپنسری کی دو الماریوں کے علاوہ وہاں ایک چھوٹا سا تخت بھی تھا جس پر غالباً وہ مریض لٹا کر دیکھا کرتی تھی۔

مس فریا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی ٹوپی اتار دی اور ایک کیل پہ لٹکا دی۔ سہیل اس بنچ پہ بیٹھ گیا جو میز کے پاس بچھی ہوئی تھی ٹوپی اتار کر مس فریا نے نیم انگریزی اور نیم ہندوستانی لہجہ میں آواز دی "چھبو کرما۔ کمرے کے دوسرے حصے سے ایک مریل سا آدمی نکل آیا اور کہنے لگا۔ "ہاں حکیم صاحب۔"

حکیم صاحب کچھ نہ بولیں اور دوا بنانے کے لئے اندر چلی گئیں۔ سہیل اس دوران میں سوچتا رہا کہ مس فریا سے کسی طرح دوستی پیدا کرنی چاہئے۔ وہ تھوڑا سا وقت جو اسے ملا اسی سوچ بچار میں خرچ ہو گیا اور مس فریا دوا بنا کر لے آئی۔ کرسی پہ بیٹھ کر اس نے شیشی پہ گوند سے لیبل چپکایا اور پڑیوں پہ نمبر لگانے کے بعد کہا "یہ دو دوائیں۔ پڑیا ابھی جا کر پانی کے ساتھ دیدیجئے اور اس میں سے ایک خوراک آدھے گھنٹے کے بعد پلا دیجئے گا۔ پھر ہر تیسرے گھنٹے کے بعد اسی طرح۔"

سہیل نے پڑیاں اٹھا کر جیب میں رکھ لیں شیشی ہاتھ میں لے لی۔ اور مس فریا کی طرف کچھ عجیب نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

وہ گھبرا گئیں۔ "آپ بھول تو نہیں گئے۔"

سہیل نے اسی انداز سے دیکھتے ہوئے کہا "میں بھولا نہیں مجھے سب کچھ یاد ہے۔"

مس فریا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔" تو ..... تو ..... ٹھیک ہے..... "

سہیل دراصل اپنے ارادہ کو مکمل کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"مس فریا نے چند کاغذات اٹھا کر میز کے ایک طرف رکھ دیئے۔" اس کے..... اس کے دام؟"

سہیل نے خاموشی سے بٹوہ نکالا۔ "کتنے ہوئے۔" یہ کہہ کر اس نے پانچ کا نوٹ بڑھا دیا۔

مس فریا نے نوٹ لیا۔ میز کی دراز کھول کر اس میں رکھا جلدی ریزگاری نکالی اور حساب کر کے باقی پیسے سہیل کی طرف بڑھا دیئے

سہیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور جلدی سے کہا۔ "تمہارا ہاتھ کتنا خوبصورت ہے"

مس فریا تھوڑی دیر تک فیصلہ نہ کر سکی کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

سہیل نے بڑے ہی خام انداز میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا جیسے وہ اسٹیج پر عشقیہ پارٹ ادا کر رہا ہے۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

سہیل کو جب مس فریا کے لہجے میں کھردرا پن محسوس ہوا تو وہ چونکا

اس نے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ اینگلو انڈین اور کرسچین لڑکیاں فوراً ہی پھنس جایا کرتی ہیں۔ چونکہ اسی سنی سنائی بات کے زیر اثر اس نے اتنی جرأت کی تھی۔ مگر یہاں جب اسے معاملہ بالکل برعکس نظر آیا تو اس نے جلدی سے دوا کی شیشی اٹھائی اور کہا "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل مجھے آپ سے ایسی فضول باتیں نہیں کرنا چاہئے تھیں۔ .... میں ..... میں نہ جانے کیا بک گیا۔ مجھے معاف کر دیجئے گا۔"

مس فریا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا غصہ کچھ کم ہو گیا۔ "تم نے جو کچھ کیا ہے۔ اس پر مجھے بے حد غصہ آیا تھا۔ مگر میں اب تمہاری طرف دیکھتی ہوں تو مجھے تم بہت ہی معصوم نظر آتے ہو ـــــ بیوقوفی کی حد تک معصوم، جاؤ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔"

سہیل سہم سا گیا۔ مس فریا کو وہ اسکول کی استانی سمجھنے لگا۔ "آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا۔"

مس فریا کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پیدا نہ ہوئی جو سہیل چاہتا تھا کہ پیدا ہو "جاؤ میں نے کہہ دیا کہ پھر ایسی حرکت نہ کرنا ـــــ دوا کسی اور جگہ سے نہ لینا۔ کل یہیں چلے آنا ـــــ اور دیکھو تم نے میرے آنے جانے کے پیسے نہیں دیئے۔

سہیل نے پوچھا۔ "کتنے ہوئے ہیں"۔

"بارہ آنے"۔

سہیل نے بارہ آنے میز پہ رکھ دیئے اور جب وہ بازار میں پہنچا تو اُسے خیال آیا کہ وکٹوریہ والے کو تو وہ بارہ آنے ادا کر چکا تھا۔ لیکن اس نے سوچا کہ چلو بلا ٹل گئی ہے۔ کیا ہوا اگر بارہ آنے زیادہ چلے گئے۔

سہیل کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ امرتسر میں وہ کئی لڑکیوں سے ایسی اور اس سے بھی سخت جھڑکیاں کھا چکا تھا۔ چند گھنٹوں تک اس واقعہ کا سہیل پہ بہت ہی زیادہ اثر رہا۔ لیکن جب وہ دوسرے دن مس فریا کے ہاں دوا لینے کے لئے گیا اُس نے دوسرے گاہکوں کی طرح اس سے بات چیت کی تو وہ شرمندگی جس کا تھوڑا سا احساس باقی رہ گیا تھا دور ہو گئی۔

دس بارہ روز تک وہ متواتر دوا لینے کے لئے مس فریا کے ہاں جاتا رہا۔ اس دوران میں کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے سہیل کے دماغ میں اس خفت انگیز واقعہ کی یاد تازہ ہوتی۔ اس کے بعد اس کی بہن تندرست ہو گئی اور مس فریا اس عرصہ کے لئے اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اب ایک دم بارہ تیرہ مہینے کے بعد سہیل کو اس کا خیال آیا اور اس نے اس سے مشورہ لینے کا ارادہ کیا۔ "عورت کو روپے پیسے کا بہت

لالچ ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ضرور اس معاملہ میں ہماری مدد کرنے کو تیار ہو جائے گی اور پھر اس واقعہ کو اس بات سے کیا تعلق ہے۔ اگر وہ میرا کام کر دے گی تو میں اسے منہ مانگے دام ادا کر دوں گا۔"

دوسرے روز شام کو وہ مس فریا کے پاس گیا۔ سہیل کو دیکھ کر اس نے بڑے کاروباری انداز میں کہا "بہت مدت کے بعد تشریف لائے۔"

سہیل شادی کے بعد اب کافی تبدیل ہو چکا تھا۔ آرام سے بنچ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا اس دوران میں کوئی بیمار نہیں ہوا۔ اس لئے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

مس فریا مسکرائی۔ "اب کیسے آنا ہوا۔"

سہیل نے جواب دیا "میں اپنی بیوی کے متعلق کچھ پوچھنے آیا ہوں۔"

مس فریا نے اور زیادہ متوجہ ہو کر پوچھا "آپ کی شادی ہو گئی۔؟"

"جی ہاں ——— ہو گئی۔"

"کب ہوئی۔"

"ایک مہینہ پہلے۔"

"صرف ایک مہینہ۔"

مس فریا نے کرسی پر اپنا پہلو بدلا "کیسی ہے آپ کی بیوی۔"

سہیل نے بالکل رسمی انداز میں جواب دیا "بہت اچھی ہے۔"

"میرا مطلب ہے کہ . . . . . کہ . . . . . خوبصورت ہے؟ — ضرور خوبصورت ہو گی۔ پنجاب کی لڑکیاں عام طور پر خوبصورت ہوتی ہیں۔"

سہیل نے فریا کی طرف دیکھا، چہرے پر اس نے پوڈر لگا رکھا تھا جس سے رنگ بہت ہی بدنما ہو گیا تھا۔ بال خشک اور بے جان تھے۔ فراک بھی نہایت بھونڈا تھا۔ جب اس عائشہ کا خیال کیا تو فریا اسے بھنگن معلوم ہوئی دل ہی دل میں وہ ہنسا اور پرانا بدلہ لینے کی خاطر اس نے کہا "میری بیوی بہت خوبصورت ہے — تم اسے دیکھو گی تو پتہ چلے گا۔"

مس فریا نے شاید یہ بات نہ سنی۔ کیونکہ وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

"تو ایک مہینے سے تم عیاشی کر رہے ہو۔"

سہیل نے پھر اسے جلانے کے لئے کہا۔ "انسان کو زندگی زندگی میں ایک بار ایسا موقع ملتا ہے۔ کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے!"

"ہاں ہاں ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے . . . . . . مگر . . . . . زیادہ نہیں تم ضرور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوں گے۔"

مس فریا کے لہجے میں ایک عجیب قسم کی للچاہٹ تھی۔

سہیل کو اس گفتگو میں مزہ آنے لگا۔ مسکرا کر اس نے کہا "زیادہ سے زیادہ کیوں نہ اٹھایا جائے — یہی وقت تو ہے کہ جی بھر کے لطف اٹھایا جائے۔ بیوی اچھی ہو، طبیعتیں آپس میں مل جائیں — جوانی ہو، حالات

سازگار ہوں۔ موسم خوشگوار ہو تو ......"

مس فریا مضطرب ہو گئی۔ یہ اضطراب چھپانے کی خاطر اس نے کہا۔" آپ
.... کس قسم کا مشورہ لینے کے لئے آئے ہیں۔

میں اپنی بیوی کے متعلق کچھ پوچھنے آیا تھا۔"

"مس فریا پھر اسی رو میں بہہ گئی۔" میں...... میں اس کو ضرور دیکھوں گی۔ مجھے...... مجھے خوشی ہو گی۔ کیسے معلوم تھا کہ تم اتنی جلدی شادی کر لو گے تمہاری زندگی میں..... میرا مطلب ہے کہ تمہاری زندگی میں ضرور ایک بہت بڑی تبدیلی ہو گئی ہو گی۔

سہیل نے جواب دیا۔" تبدیلی ــ کوئی خاص تبدیلی پیدا تو نہیں ہوئی میں پہلے بھی ایسا ہی تھا ــ خاص فرق پڑ بھی کیا سکتا ہے۔

ہر حال میں خوش ہوں۔ بہت ہی خوش ہوں ــ شادی بہت اچھی چیز ہے؟

مس فریا نے تھوک نگل کر کہا" کیا شادی واقعی بہت اچھی چیز ہے؟"

بہت ہی اچھی چیز ہے ــ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی شادی کر لو۔"

مس فریا نے میز پر سے رنگین تیلیوں کا بنا ہوا جاپانی پنکھا اٹھایا اور جھلنا شروع کر دیا۔" مجھے اپنی بیوی کے متعلق کچھ اور بتاؤ ــ یعنی تمہاری ازدواجی زندگی کیسے گذر رہی ہے.... اس کے خیالات کیا ہیں۔

فریا کے ہونٹوں پر کھسیانی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس کے ہونٹ کچھ اس انداز سے باتیں کرتے وقت کھل رہے تھے کہ سہیل کو محسوس ہوا۔ فریا کے چہرے پر منہ کے بجائے ایک زخم ہے۔ جس کے ٹانکے ادھڑ رہے ہیں ـــ

سہیل نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور یوں دیکھتے ہوئے وہ ایک برس پیچھے چلا گیا جب اس نے بڑی نیک نیتی سے اس عورت میں چند خوبصورتیاں تلاش کی تھیں اور ان کا سہارا لے کر اس سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی ایک نہایت ہی بھونڈی کوشش کی تھی۔ اب وہی عورت اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی پنکھا جھل کر اپنا اندرونی اضطراب ہلکا کر رہی تھی۔ ایک برس اس کے کالے چہرے اور خشک بالوں پر سے مزید سیاہی اور خشکی پیدا کئے بغیر گذر گیا تھا۔ مگر سہیل اب بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مس فریا نے اس سے کہا "تم کتنے تبدیل ہو گئے ہو۔ اب تم پورے مرد بن چکے ہو۔"

سہیل نے فریا کی طرف دیکھا اس کی مونچھوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر اب اس کے دل میں وہ پہلی سی خواہش پیدا نہ ہوئی۔

مس فریا نے پنکھا میز پر رکھ دیا اور کہنیاں ٹیک کر سہیل کی طرف ان

بلبلوں کی طرح دیکھنے لگی جو موسم بہار میں بوٹ کر اداس اداس آوازیں نکالا کرتی ہیں۔

سہیل نے پنکھے کی ایک اکھڑی ہوئی تیلی نوچنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مس فریا نے اسے آہستہ سے پکڑ کر کہا "یاد ہے نہیں، ایک دفعہ اسی طرح تم نے میرا ہاتھ دبایا تھا۔"

مس فریا کی آواز لرزاں تھی۔

سہیل نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بڑے خشک لہجہ میں کہا "مس فریا۔ تمہاری یہ حرکت بہت ہی نازیبا ہے ..... دیکھو، پھر کبھی ایسا نہ کرنا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا بٹوا لرزتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا اور بارہ آنے نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ یہ رہا تمہارے آنے جانے کا کرایہ۔"

سہیل جب نیچے اترا تو بازار میں چلتے ہوئے اس نے سوچا "جب بچہ پیدا ہو گا تو میں اسے گود میں اٹھا کر مس فریا کے پاس ضرور آؤں گا اور فخر کے ساتھ کہوں گا۔ اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔؟"

سہیل بہت خوش تھا جب اس نے مزا لینے کی خاطر یہ سارا واقعہ دہرایا تو آخر میں بارہ آنے آئے جو اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نکال کر مس فریا کی میز پر رکھے تھے "ارے — یہ میں نے اسے بارہ آنے کیوں دیئے یہ کرایہ کس بات کا تھا؟" —

سہیل جب اس کا جواب تلاش نہ کر سکا تو بے اختیار ہنس پڑا۔

غسل خانہ

صدر دروازے کے اندر داخل ہوتے سیڑھیوں کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جس میں کبھی اُپلے اور لکڑیاں کوئلے رکھے جاتے تھے۔ مگر اب اس میں نل لگا کر اس کو مردانہ غسل خانے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ فرش وغیرہ مضبوط بنا دیا گیا ہے تاکہ مکان کی بنیادوں میں پانی نہ چلا جائے۔ اس میں صرف ایک کھڑکی ہے جو گلی کی طرف کھلتی ہے۔ اس میں زنگ آلود سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔

میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب یہ غسل خانہ میری زندگی میں داخل ہوا۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ غسل خانے انسانوں کی زندگی میں کیوں کر داخل ہو سکتے ہیں۔ غسل خانہ تو ایسی چیز ہے جس میں آدمی داخل ہوتا ہے

اور دیر تک داخل رہتا ہے۔ لیکن جب آپ میری کہانی سن لیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ غسل خانہ واقعی میری زندگی میں داخل ہوا اور اس کا ایک اہم ترین جزو بن کے رہ گیا۔

یوں میں اس غسل خانے سے اس وقت کا متعارف ہوں جب اس میں اپلے وغیرہ پڑے رہتے تھے اور میری بلی نے اس میں بھیگے ہوئے چوہوں کی شکل کے چار بچے دیئے تھے۔ ان کی آنکھیں دس بارہ روز تک مندی رہی تھیں۔ چنانچہ جب میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا۔ تو اس کی آنکھیں کھلی دیکھ کر میں نے امی جان سے کہا تھا۔ امی جان میری بلی ٹیڈی نے جب بچے دیئے تھے تو ان کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کی کیوں کھلی ہوئی ہیں؟"

یعنی میں بچپن ہی سے اس غسل خانے کو جانتا ہوں لیکن یہ میری زندگی میں اس وقت داخل ہوا جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک بھاری بھرکم بستہ بغل میں دبا کر ہر روز اسکول جایا کرتا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے۔ میں نے اسکول سے گھر آتے ہوئے سردار دوہا دا سنگھ پھل فروش کی دکان سے ایک کابلی انار چرایا۔ میں اور میرے دو ہم جماعت لڑکے ہر روز کچھ نہ کچھ اس دکان سے چرایا کرتے تھے۔ لیکن بھائی دوہا دا سنگھ جو پھلوں کے ٹوکروں میں گھر ایک بڑی سی پگڑی اپنے کیسوں پر رکھے سارا دن افیم کے نشے میں اونگھتا رہتا تھا خبر تک نہ ہوتی تھی۔ مگر بات یہ

ہے کہ ہم بڑی بڑی چیزیں چراتے تھے۔ کبھی انگور کے چند دانے اٹھا لئے کبھی لوکاٹھ کا ایک گچھا لے اڑے۔ کبھی مٹھی بھر خوبانیاں اٹھائیں اور چلتے بنے۔ لیکن اس دفعہ چونکہ میں نے زیادتی کی تھی اس لئے پکڑا گیا۔ ایک دم بھائی دوہاوا سنگھ اپنی بلند سے چونکا اور انتی پرتی سے نیچے اتر کر اس نے مجھے ننگے ہاتھوں سے پکڑا کر میں دنگ رہ گیا۔ ساتھ ہی میرے حواس باختہ ہو گئے۔ پہلے تو میں اس چوری کو کھیل سمجھا تھا۔ لیکن جب میلی داڑھی والے سردار دوہاوا سنگھ نے اپنی پھولی ہی رگوں والے ہاتھ سے میری گردن ناپی تو مجھے احساس ہوا کہ میں چور ہوا۔

بچپن ہی سے مجھے اس بات کا خیال رہا ہے کہ لوگوں کے سامنے میری ذلت نہ ہو۔ چنانچہ سر بازار جب میں نے خود کو ذلیل ہوتے دیکھا تو فوراً دوہاوا سنگھ سے معافی مانگ لی۔ آدمی کا دل بہت اچھا تھا۔ انار میرے ہاتھ سے چھین کر اس نے وہ میل جو اس کے خیال کے مطابق انار کو لگ گیا تھا اپنے کرتے سے صاف کیا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ "وکیل صاحب آئے تو میں ان سے کہوں گا کہ آپ کے لڑکے نے اب چوری شروع کر دی ہے!"

میرا دل دھک سے رہ گیا میں تو سمجھا کہ سستے چھوٹ گئے۔ وکیل صاحب یعنی میرے اباجی سردار دوہاوا سنگھ نہیں تھے وہ نانیم کا نشہ

کرتے تھے اور نہ انہیں پھلوں ہی سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں نے سوچا اگر اس کمبخت ددہاوا سنگھ نے ان سے میری چوری کا ذکر دیا تو وہ گھر میں داخل ہوتے ہی امی جان سے کہیں گے۔ کچھ سنتی ہو، اب تمہارے اس برخوردار نے چوری چکاری بھی شروع کردی ہے۔ سردار ددہاوا سنگھ نے جب مجھ سے کہا کہ وکیل صاحب آپ کا لڑکا انار اٹھا کے بھاگ گیا۔ مجھا تو خدا کی قسم میں شرم سے پانی پانی ہوگیا ——— میں نے آج تک اپنی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دی تھی۔ لیکن اس نالائق نے میری ساری عزت خاک میں ملادی ہے۔"

وہ مجھے دو تین طمانچے مار کر مطمئن ہو جاتے۔ مگر امی جان کا ناک میں دم کر دیتے۔ اس لئے کہ وہ ہماری طرف داری کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ ان کی اولاد ہم چھ بیٹے تھے) سے کوئی چھوٹی سی لغزش ہو اور وہ آنگن میں اپنے گنجے سر کا پسینہ پونچھ کر امی جان کو کوسنا شروع کر دیں۔ جیسے سارا قصور ان کا ہے۔

کوسنے کے بعد بھی ان کا جی ہلکا نہیں ہوتا تھا۔ اس روز کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اور دیر تک خاموش آنگن میں سمٹ لگے فرش پہ ادھر ادھر ٹہلتے رہتے تھے۔

جس وقت بھائی ددہاوا سنگھ نے وکیل صاحب کا نام لیا۔ میری

آنکھوں کے سامنے ابا جی کا گنجا سر آ گیا جس پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں ان کو ہمیشہ غصے کے وقت اس جگہ پہ پسینہ آتا ہے۔

بستہ میری بغل میں بہت وزنی ہو گیا۔ ٹانگیں بے جان سی ہو گئیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ شرم کا وہ احساس جو چوری پکڑے جانے پہ پیدا ہوا مٹ گیا اور اس کی جگہ ایک تکلیف دہ خوف نے لے لی۔ ابا جی کا گنجا سر۔ اس پہ چمکتی ہوئی پسینے کی ننھی ننھی بوندیں۔ آنگن کا سیمنٹ لگا فرش۔ اس پہ ان کا غصے میں اِدھر اُدھر چکر لگاتے ہوئے ببر شیر کی طرح چلنا اور رک رک کر امی جان پہ برسنا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سخت پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا۔ غسل خانے کے پاس ٹھہر کر میں نے ایک بار سوچا کہ اگر میں اس کمبخت پھل فروش نے سچ مچ ابا جی سے کہہ دیا تو آفت ہی آ جائے گی اور تین روز کے لئے سارا گھر جہنم کا نمونہ بن جائیگا ابا جی اور سب کچھ معاف کر سکتے تھے۔ لیکن چوری کبھی معاف نہیں کرتے تھے۔ ہمارے پرانے ملازم بنو نے ایک بار دس روپے کا نوٹ امی جان کے پان دان سے نکال لیا تھا۔ امی جان نے تو اسے معاف کر دیا تھا لیکن ــــ ابا جی کو جب اس چوری کا پتا چلا تو انھوں نے اسے نکال باہر کیا۔ "میں اپنے گھر میں کسی چور کو نہیں رکھ سکتا۔"

ان کے یہ الفاظ میرے کانوں میں کئی بار گونج چکے تھے۔ میں نے اوپر

جانے کے لئے زینے پر قدم ہی رکھا کہ ان کی آواز میرے کانوں میں آئی جانے وہ میرے بڑے بھائی ثقلین سے کیا کہہ رہے تھے۔ لیکن میں یہی سمجھا کہ وہ نتو کو گھر سے باہر نکال رہے ہیں اور اس سے غصے میں یہ کہہ رہے ہیں۔ "میں اپنے گھر میں کسی چور کو نہیں رکھ سکتا۔"

میرے قدم منوں بھاری ہو گئے میں اور زیادہ سہم گیا اور باہر جانے کے بجائے نیچے اتر آیا۔ خدا معلوم کیا جی میں آئی کہ غسل خانے کے اندر جا کر میں نے صدق دل سے دعا مانگی کہ اباجی کو میری چوری کا علم نہ ہو۔ یعنی ــــ دوہا واسنگھ ان سے اس بات کا ذکر کرنا بھول جائے۔ دعا مانگنے کے بعد میرے جی کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ چنانچہ میں اوپر چلا گیا۔

خدا نے میری دعا قبول کی۔ دوہا واسنگھ اور اس کی دکان ابھی تک موجود ہے لیکن اس نے اباجی انار کی چوری کا ذکر نہیں کیا ــــ غسل خانہ یہیں سے میری زندگی میں داخل ہوتا ہے

ایک بار پھر ایسی ہی بات ہوئی۔ میں زیادہ لطف لینے کی خاطر پہلی دفعہ بازار میں کھلے بندوں سگریٹ پیتے جا رہا تھا کہ اباجی کے ایک دوست سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے سگریٹ میرے ہاتھ سے چھین کر غصے میں ایک طرف پھینک دیا اور کہا "تم بہت آوارہ ہو گئے ہو۔ بڑوں کا احترام و لحاظ اب تمہاری آنکھوں میں بالکل نہیں۔ خواجہ صاحب سے کہہ کر آج تمہاری اچھی

طرح گوشمالی کرائیں گا۔"

انار کی چوری کے مقابلے میں کھلے بندوں سگریٹ پینا اور بھی زیادہ خطرناک تھا خواجہ صاحب یعنی میرے ابّاجی خود سگریٹ پیتے تھے مگر اپنی اولاد کے لئے انہوں نے اس چیز کو قطعی طور پر ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ ایک روز میرے بڑے بھائی کی جیب میں انہیں سگریٹ کی ڈبیا مل گئی تھی جس پر انہوں نے ایک تھپڑ لگا کر فیصلہ کن لہجے میں یہ الفاظ کہے تھے "ثقلین اگر میں نے تمہاری جیب میں پھر سگریٹ کی ڈبیا دیکھی تو میں تمہیں اس روز گھر سے باہر نکال دوں گا۔ سمجھ گئے؟"

ثقلین سمجھ گیا۔ چنانچہ وہ ہر روز صرف ایک لاتا تھا اور پاخانے میں جا کر پیا کرتا تھا۔

ثقلین سے میں تین برس چھوٹا ہوں۔ ظاہر ہے میرا سگریٹ پینا اور وہ بھی بازاروں میں کھلے بندوں ——— اباجی کسی طرح بھی برداشت نہ کرتے تھے۔ ان کو تو انہوں نے صرف دھمکی دی تھی مگر مجھے وہ یقیناً گھر سے باہر نکال دیتے۔

گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے غسل خانے میں جا کر صدقِ دل سے دعا مانگی کہ اے خدا اباجی کو میرے سگریٹ پینے کا کچھ علم نہ ہو۔ دعا مانگنے کے بعد میرے دل پر سے خوف کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور میں اوپر

چلا گیا۔

آپ کہیں گے کہ میں خاص طور پر غسل خانے میں داخل ہو کر ہی کیوں دعا مانگتا تھا۔ دعا کہیں بھی مانگی جا سکتی ہے۔ درست ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں دل میں اگر کوئی بات سوچوں تو اس کے ساتھ اور بہت سی غیر ضروری باتیں خود بخود آ جاتی ہیں۔ میں نے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں دعا مانگی تھی۔ مگر میرے دل میں کئی اوٹ پٹانگ باتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ دعا اور یہ باتیں غلط ملط ہو کر ایک بے ربط عبارت بن گئی تھی۔

"اللہ میاں ۔۔۔۔۔ میں نے سگریٹ ۔۔۔۔۔۔ بیڑا غرق ایک پوری ڈبیا سگرٹوں کی میرے نیکر کی جیب میں پڑی ہے اگر کسی نے دیکھ لی تو کیا ہوگا ــــ کہیں ثقلین ہی نہ لے اڑے ۔۔۔۔۔۔۔۔ اللہ میاں ۔۔۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سگریٹ پینے میں کیا برائی ہے ابا جی نے بھی جماعت سے پینے شروع کئے تھے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اللہ میاں ۔۔۔ ۔۔۔۔ سگریٹ والے کے ساڑھے تیرہ آنے میری طرف نکلتے ہیں۔ ان کی ادائیگی کیسے ہو گی اور اسکول میں مٹھائی والے کے بھی چھ آنے دینا ہیں ۔۔۔۔ مٹھائی اس کی بالکل واہیات ہے۔ لیکن میں کھاتا کیوں ہوں۔؟ ۔۔۔۔ اللہ میاں مجھے معاف کر دے ۔۔۔ ۔۔۔ جو سگریٹ ابا جی پیتے ہیں ان کا مزا کچھ اور ہی قسم کا ہوتا ہے ــــ پان کھا کر سگریٹ پینے

کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے ...... اللہ میاں ..... اب کے نمبر بچ جائیں گے تو سگرٹوں کا ڈبہ ضرور خرید یں گے ...... کب تک سگریٹ والا ادھا دیتا جائے گا۔ امی جان کا بٹوہ ..... اللہ میاں مجھے معاف کر دے۔"

میں دل ہی دل میں خاموش دعا مانگوں تو بھی گڑبڑ ہو جاتی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مجھے غسل خانے کے اندر جانا پڑتا تھا۔ دروازہ بند کر کے لگائیں اٹھائیں۔ سانس روکا اور ہولے ہولے دعا گنگنانا شروع کر دی۔ عجیب بات ہے کہ جو دعا میں نے اس غلیظ غسل خانے میں مانگی۔ قبول ہوئی ماما کی چوری کا اباجی کو کچھ علم نہ ہوا۔ سگریٹ پینے کے متعلق بھی وہ کچھ جان نہ سکے۔ اس لئے کہ ان کا دوست اس روز شام کو کلکتے چلا گیا جہاں اس نے مستقل رہائش اختیار کر لی۔

غسل خانے سے میرا اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا جب میں نے دسویں جماعت کا امتحان دینے کے دوران میں مانگی اور وہ قبول ہوئی جیومیٹری کا پرچہ تھا۔ میں نے غسل خانے میں جا کر تمام پراپوزیشن کتاب سے پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیں اور دعا مانگی کہ کسی ممتحن کی نظر نہ پڑے۔ اور میں اپنا کام اطمینان سے کر لوں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ میں نے پھاڑے ہوئے اوراق نکال کر کاغذوں کے نیچے ڈسک پہ رکھ لئے اور اطمینان سے بیٹھا نقل کرتا رہا۔

ایک بار نہیں پچیسویں بار میں نے اس غسل خانے میں حالات کی نزاکت محسوس کر کے دعا مانگی جو قبول ہوئی۔ میرے بڑے بھائی ثقلین کو اس کا علم تھا۔ مگر وہ میری ضعیف الاعتقادی سمجھتا تھا ـــــ بھئی کچھ بھی ہو۔ میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ اس غسل خانے میں مانگی ہوئی دعا کبھی خالی نہیں گئی۔ میں نے اور جگہ بھی دعائیں مانگ کر دیکھی ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی قبول نہیں ہوئی ـــــ کیوں؟ ـــــ اس کا جواب نہ میں دے سکتا ہوں اور نہ میرا بڑا بھائی ثقلین ـــــ ممکن ہے آپ میں سے کوئی صاحب دے سکیں۔

چند برس پہلے کا ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ میرے چچا جان کی شادی تھی۔ آپ سنگاپور سے اس غرض کے لئے آئے تھے چونکہ ان کا اور ہمارا گھر .... بالکل ساتھ ساتھ ہے اس لئے جتنی رونق ان کے مکان میں تھی اتنی ہی ہمارے مکان میں بھی تھی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی کہیئے کیونکہ لڑکی والے ہمارے گھر آ گئے تھے۔ آدھی رات ڈھولک کے گیت، گائے جاتے تھے۔ ہونے والی دلہن سے چھیڑ چھاڑ، عجیب غریب رسمیں۔ تیل مہندی اور نہ معلوم کیا کیا کچھ ـــــ بچوں کی چیخ و پکار ـــــ اللہ لڑکیوں کی نئی گرگابیوں اور سینڈلوں میں ایک عجلت بھرت ـــــ اوٹ پٹانگ کھیل ـــــ غرض کہ ہر

وقت ایک ہنگامہ مچا رہتا تھا۔

جب اس قسم کی خوشگوار سا فراتفری پھیلی ہو تو لڑکیوں کو چھیڑنے کا لطف آتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ شادی بیاہ کے ایسے ہنگاموں ہی پر لڑکیوں کو چھیڑنے کا موقع ملتا ہے ــــ ہمارے دور کے رشتہ دار شالیاف تھے۔ ان کی لڑکی مجھے بہت پسند تھی۔ اس سے پہلے تین چار مرتبہ ہمارے یہاں آچکی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک رکی ہوئی ہنسی ہے ــــ نہیں۔ میں اپنے مافی الضمیر کو ابھی بیان نہیں کر سکا۔ اس کا سارا وجود کھلکھلا کر ہنس اٹھتا اگر اس کو ذرا سا چھیڑ دیا جا۔ بالکل ذرا سا یعنی اس کو اگر صرف چھو لیا جاتا تو بہت ممکن ہے وہ ہنسی کا فوارہ بن جاتی ــــ اس کے ہونٹوں اور اس کی آنکھوں کے کونوں میں اس کی ناک کے ننھے نتھنوں میں۔ اس کی پیشانی کی مصنوعی تیوریوں میں اس کے کان کی لوؤں میں ہنسی کے ارادے مرتعش رہتے تھے ــــ میں نے اس کے چھیڑنے پورا تہیہ کر لیا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سیڑھیوں کی بتی خراب ہو گئی۔ بلب فیوز ہوا یا کیا ہوا بہر حال اچھا ہوا کیونکہ وہ بار بار کہیں نیچے آتی تھی اور کبھی اوپر جاتی تھی۔ میں غسل خانے کے پاس اندھیرے میں ایک ہو کر کھڑا ہو گیا وہ اوپر جاتی یا نیچے جاتی مجھ سے اس کی مڈبھیڑ ضرور ہوتی اور میں اندھیرے

میں اس سے فائدہ اٹھاکر اپنا کام کر جانا ــــ بات معقول تھی چنانچہ کچھ دیر دم سادھے اس کا منتظر رہا۔ اور اس دوران میں اپنی آنکھوں کو تاریکی کا عادی بناتا رہا۔

کسی کے نیچے اترنے کی آواز آئی ــــ کھٹ ــــ کھٹ ــــ کھٹ ــــ میں تیار ہوگیا ...... اباجی تھے۔ انھوں نے پوچھا کون ہے؟ ــــ میں نے کہا "جی! عباس"۔ انھوں نے اندھیرے میں ایک زور طمانچہ میرے منہ پر مارا اور کہا "تمہیں شرم نہیں آتی۔ یہاں چھپ کر لڑکیوں کو چھیڑتے ہو۔ ثریا ابھی ابھی اپنی ایک سہیلی سے تمہاری اس بیہودہ حرکت کا ذکر کر رہی تھی۔ اگر اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ ــــ واہیات کہیں کے! ــــ تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں اپنے بڑوں کی آبروہی کا کچھ لحاظ کرو ــــ اور ثریا کی ماں نے آج ہی ثریا کے لئے تمہیں مانگا ہے ــــ لعنت ہو تم پر ــــ"

کھٹ کھٹ کھٹ ــــ کسی کے نیچے اترنے کی آوازآئی۔ ابا جی نے میرے حیرت زدہ منہ پر ایک اور طمانچہ رسید کیا اور بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

کھٹ کھٹ کھٹ ــــ ثریا تھی ــــ میرے پاس سے گذرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی اور حیاآلود غصے کے ساتھ یہ کہتی چلی گئی۔

"خبردار جواب آپ نے مجھے چھیڑا۔ امی جان سے کہہ دوں گی۔"

میں اور بھی زیادہ متحیر ہو گیا۔ دماغ پہ بہت زور دیا مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ اتنے میں غسل خانے کا دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور ثقلین باہر نکلا۔ میں نے اس سے پوچھا "تم یہاں کیا کر رہے تھے؟"

اس نے جواب دیا "دعا مانگ رہا تھا"۔

میں نے پوچھا "کس لئے"۔

مسکرا کر اس نے کہا۔ "ثریا کو میں نے چھیڑا تھا"۔

میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ اس غسل خانے میں جو دعا مانگی جائے ضرور قبول ہوتی ہے۔

خونی تھوک

گاڑی آنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔

مسافروں کے گروہ کے گروہ پلیٹ فارم کے سنگین سینے کو روندتے ہوئے ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ پھل بیچنے والی گاڑیاں ربڑ کے ٹائر کے پہیوں پر خاموشی سے تیر رہی تھیں۔ بجلی کے سینکڑوں قمقمے اپنی نہ جھپکنے والی آنکھوں سے ایک دوسرے کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ بیتی پنکھے سرد آہوں کی صورت میں اپنی ہوا پلیٹ فارم کی گدلی فضا میں بکھیر رہے تھے دور سے ریل کی پٹڑی کے پہلو میں ایک لیمپ سرخ لگا ہوں سے مسافروں کی آمدورفت کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ پلیٹ فارم کی فضا سگریٹ کے تند دھوئیں اور مسافروں کے شور میں لپٹی ہوئی تھی۔

پلیٹ فارم پر ہر ایک اپنی دھن میں مست تھا۔ تین چار بنچ پر بیٹھے

اپنی ہونے والی سیر کا تذکرہ کر رہے تھے۔ ایک گھڑی کے نیچے خدا معلوم کن خیالات میں غرق گنگنا رہا تھا۔ دور کونے میں نیا بیاہا جوڑا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ خاوند اپنی بیوی کو کچھ کھانے کے لئے کہہ رہا تھا اور وہ شرما کر مسکرا دیتی تھی۔ پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پرے پر ایک نوجوان قلیوں کے ساتھ لڑکھڑا کر چل رہا تھا جو اس کی بہن کا تالوت اٹھائے ہوئے تھے۔ پانچ چھ فوجی سپاہی ہاتھ میں چھڑیاں لئے اور سیٹی بجاتے ہوئے ریفرشمنٹ روم سے شراب پی کر نکل رہے تھے۔ ایک سٹال پر چند مسافر اپنا وقت ٹالنے کی خاطر یونہی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے میں مشغول تھے۔ بہت سے قلی سرخ وردیاں پہنے گاڑی کی روشنی کا امید بھری نگاہوں سے انتظار کر رہے تھے ـــ ریفرشمنٹ روم کے اندر ایک صاحب انگریزی لباس زیب تن کئے سلگار کا دھواں اڑا کر وقت کاٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"قلیوں کی زندگی بھی گدھوں سے بدتر ہے"

"مگر میاں کیا کریں۔ آخر پیٹ کہاں سے پالیں"۔

"ایک قلی دن بھر میں کتنا کما لیتا ہے"۔

"یہی آٹھ دس آنے!"

"یعنی صرف جینے کا سہارا ـــ اور اگر بال بچے ہوں تو اپنا پیٹ کاٹ کر ان کا منہ بھریں۔ خاں! خدا کی قسم جب ان لوگوں کو تاریک زندگی کا خیال

ایک دفعہ بھی میرے دماغ میں آجائے تو پہروں یہی سوچتا ہوں کہ آیا ان کی مصیبت ہماری نام نہاد تہذیب پر بدنما نہیں ہے؟"

وہ دو دوست پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ خالد اپنے دوست کی گفتگو سن کر قدرے متعجب ہوا اور مسکرا کر کہنے لگا کیوں میاں یہ بیتن کب سے بنے ہو تم؟ ——— تہذیب کس بلا کا نام ہے انسانیت کے سر دوہے پر جا ہوا زنگ! ——— جانے دو ——— ایسی باتوں کو جانتے ہو میں پہلے ہی سے اپنے حواس کھوئے بیٹھا ہوں۔"

"خالد سچ کہہ رہے ہو۔ یہ باتیں واقعی دماغ کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ دو روز ہوئے اخبار میں ایک خبر پڑھی کہ پندرہ مزدور کارخانے میں آگ لگ جانے سے جلے ہوئے کاغذ کی مانند راکھ ہو گئے۔ کارخانہ بیمہ شدہ تھا مالک کو روپیہ مل گیا مگر پندرہ عورتیں بیوہ ہو گئیں اور خدا معلوم کتنے بچے یتیم ہو گئے۔ کل تین نمبر پلیٹ فارم پر ایک خاکروب کام کرتے کرتے گاڑی تلے آکر مر گیا۔ کسی نے آنسو تک نہ بہایا ——— جب سے یہ واقعہ دیکھا ہے طبیعت سخت مغموم ہے۔ یقین جانو حلق سے روٹی کا ٹکڑا نیچے نہیں اترتا۔ جب دیکھو اس خاکروب کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش آنکھیں نکالے میری طرف گھور رہی ہے ——— مجھے اس کے گھر ضرور جانا چاہیے شاید میں اس کے بچوں کی کچھ مدد کر سکوں۔"

خالد مسکرایا اور اپنے دوست کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا —— "جاؤ —— پندرہ مزدوروں کی بیکس بیویوں کی مدد بھی کرو۔ یہ ایک نیک اور مبارک جذبہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی شہر سے کچھ فاصلے پر چند ایسے لوگ بھی آباد ہیں۔ جن کے پاس ایک وقت کے لئے سوکھی روٹی کا نصف ٹکڑا بھی میسر نہیں —— گلیوں میں ایسے بچے بھی ہیں جن کے سروں پر کوئی دست شفقت رکھنے والا نہیں۔ ایسی سینکڑوں عورتیں موجود جن کا حسن غربت کے کیچڑ میں گل سٹر رہا ہے —— بتاؤ! تم کس کس کی مدد کرو گے؟ ان پھیلے ہوئے ہاتھوں میں سے کس کی مٹھی بھروں گے؟ —— ہزاروں ننگے جسموں میں سے کتنوں کی ستر پوشی کرو گے؟"

آہ! درست کہتے ہو خالد!! —— درست کہتے ہو۔ مگر بتاؤ اس تاریک آندھی کو کس طرح روکا جا سکتا ہے؟ —— اپنے ہم جنس افراد کو ذلت کی زندگی بسر کرتے دیکھنا۔ ننگے سینوں پر جمکتے ہوئے بوٹوں کی ٹھوکریں لگتے دیکھنا —— سخت بھیانک خواب ہے۔"

"واقعات کی رفتار کا نتیجہ دیکھنے کا انتظار کرو۔ یہ لوگ اپنی طاقت کے باوجود اس طوفان کو نہیں روک سکتے۔ خود اعتمادی نے انہیں برداشت کرنا سکھا دیا ہے۔"

چنگاری کو شعلوں میں تبدیل کر دینا آسان ہے۔ مگر چنگاری پیدا کرنا

بہت مشکل ہے۔۔۔ بہرحال تمہیں امید رکھنی چاہیئے۔ شاید تمہاری زندگی میں مصائب کے بادل دور ہو جائیں ۔"

میں یہ سہانا وقت دیکھنے کے لئے اپنی زندگی کے بقایا سال نذر کرنے کو تیار ہوں۔"

"کاش یہی خیال باقی لوگوں کے دل میں بھی موجود ہوتا! ۔۔۔ مگر یار گاڑی آج دیر سے آتی معلوم ہوتی ہے۔ دیکھو نا پٹڑی پہ روشنی کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔"

خالد کا دوست کسی گہری فکر میں غوطہ زن تھا۔ اس لئے اس نے اپنے دوست کے آخری الفاظ بالکل نہ سنے اور اگر اس نے سنے تو کچھ خیال کر کے کہنے لگا "واقعی یہ خیال پیدا کرنا چاہیئے اور اگر ۔۔۔"

"چھوڑو میاں اب اس فلسفے کو ۔۔۔ کچھ پتہ ہے گاڑی کب آنے والی ہے۔" خالد نے اپنے دوست کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"گاڑی" اور پھر سامنے والی گھڑی کی طرف نگاہ اٹھا کر۔ نو بجکر پچیس منٹ ہیں دس منٹ تک آجائے گی ۔۔۔ یعنی دس منٹ کے بعد ہمارا دوست ہمارے پاس ہوگا۔ ذرا خیال تو کرو۔ میں وحید کی آمد اس دردناک گفتگو کی وجہ سے بالکل بھول چکا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے خالد کے دوست نے جیب سے سگریٹ نکال کر

سلگانا شروع کر دیا۔

پلیٹ فارم پہ لوگوں کا ہجوم تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ مسافر بڑی سرعت سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اسباب کے ڈھیروں کے پاس خاموش کھڑے گارڈی کے منتظر تھے کہ جلدی اپنے کام سے فارغ ہو کر ایک آنہ حاصل کر سکیں۔ خوانچہ والے دوسرے پلیٹ فارموں سے جمع ہو کر اپنی مخصوص صدا بلند کر رہے تھے۔ فضا گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ، مختلف انجنوں کی پھپ پھپ، خوانچہ والوں کی صداؤں، مسافروں کی باہم گفتگو کے شور اور قلیوں کی بھدی آوازوں سے معمور تھی ـــــ برقی پنکھے بدستور آہیں بھر رہے تھے۔

ریفرشمنٹ روم کے اندر بیٹھے ہوئے مسافر نے جو ابھی سگار کو دانتوں میں دبائے کش لے رہا تھا۔ اپنی کلائی پہ بندھی ہوئی گھڑی کی طرف بڑی بے پروائی کے انداز میں دیکھا اور بازو کو جھٹکا دے کر مرمریں میز پہ سہارا دیتے ہوئے بلند آواز میں بولا "بوائے"۔

تھوڑی دیر خادم کا انتظار کرنے کے بعد وہ پھر چیخا "بوائے ـــ بوائے۔" اور پھر آہستہ آہستہ بڑبڑاتے ہوئے۔ "نمک حرام"

"جی آیا حضور" دوسرے کمرے میں سے کسی کی آواز آئی۔

ساتھ ہی سپید لباس پہنے ایک خادم بھاگ کر اس مسافر کے

قریب مؤدب کھڑا ہوگیا۔

"حضور۔"

"ہم نے تمہیں دو دفعہ آواز دی ——— سوئے رہتے ہو تم لوگ شاید!"

"حضور میں نے سنا نہیں۔ ورنہ کیا مجال ہے کہ غلام حاضر نہ ہوتا۔"

غلام کا لفظ سن کر مسافر کا غصہ فرو ہوگیا۔

"دیکھو درجۂ اوّل کے مسافروں سے یہ بے رخی اچھی نہیں۔ ہم تمہارے بڑے صاحب کے بھی کان کھینچ سکتا ہے سمجھے"

"جی ہاں"

ایجنٹ کے! ——— وہ ہمارا دوست ہے ——— خیر! دیکھو تم ویٹنگ روم میں جاؤ اور ہمارے قلی سے کہو کہ وہ صاحب کا تمام اسباب پلیٹ فارم پر لے جائے۔ گاڑی آنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔"

"بہت اچھا حضور!"

"اور ہاں ہمارا بل دوسرے آدمی کے ہاتھ بھجوا دو۔"

"دیکھو! ——— بل میں پانچسو پچپن نمبر سگریٹ کے ایک ڈبے کے دام بھی شامل کر لینا ——— پانچسو پچپن نمبر کا ڈبہ خیال رہے۔"

"بل اور ڈبہ گاڑی میں لے کر حاضر ہو جاؤ گا۔ وقت تھوڑا ہے۔"

"جو مرضی میں آئے کرنا، مگر اب تم جاؤ اور جلد ہمارے قلی سے اسباب نکالنے کے لئے کہہ دو۔"

مسافر نے یہ کہہ کر ایک انگڑائی لی اور میز پہ پڑے ہوئے شراب کے گلاس میں سے آخری گھونٹ ایک جرعے میں ختم کر دیے، گیلے ہونٹ ایک بے داغ ریشمی رومال سے صاف کرنے کے بعد وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا۔

صاحب کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر ایک خادم نے جلدی دروازہ کھول دیا۔ مسافر بڑی رعونت سے ٹہلتا ٹہلتا پلیٹ فارم کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

وہ ریل کی آہنی پٹڑیوں کے درمیان خیرہ کن روشنی کا ایک دھبہ نظر آرہا تھا جو آہستہ آہستہ آس پاس کی تاریکی کو چیرتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ دھبہ روشنی کی ایک لمبی دھار میں تبدیل ہو گیا اور دفعتاً انجن کی چوندھیا دینے والی روشنی ایک لمحے کے لئے پلیٹ فارم کے قمقموں کو اندھا بناتی ہوئی گل ہو گئی۔ ساتھ ہی کچھ عرصے کے لئے انجن کے آہنی پہیوں کی بھاری گڑگڑاہٹ نے پلیٹ فارم کا شور دب کر رہ گیا۔ ایک چیخ کے ساتھ گاڑی اسٹیشن کے چبوترے کے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔

پلیٹ فارم کا دبا ہوا شور انجن گڑگڑاہٹ سے آزاد ہو کر ایک نئی تازگی سے بلند ہوا۔ مسافروں کی دھوڑ دھوپ، بچوں کے رونے کی آواز قلیوں کی بھاگ دوڑ، اسباب نکالنے کا شور، ٹھیلوں کی کھڑکھڑاہٹ خوانچوں والوں کی بلند صدائیں، شنٹ کرتے ہوئے انجنوں کی دلخراش چیخیں اور بھاپ نکلنے کی شاں شاں پلیٹ فارم کی آہنی چھت تلے فضا میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے تیر رہی تھی۔

"خالد —— وحید کو دیکھا تم نے کسی ڈبے میں؟"

"نہیں تو۔"

"خدا جانے اس گاڑی سے آیا بھی ہے یا نہیں۔"

"تار میں تو اسی گاڑی کا ذکر تھا —— ارے وہ ڈبہ میں کون ہے؟"

"وحید —!"

"ہاں، ہاں وحید۔"

دونوں دوست بھاگتے ہوئے اس ڈبے کی طرف بڑھے جس میں سے وحید اپنا اسباب اتروا رہا تھا

ریفرشمنٹ روم والا مسافر تیزی سے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا۔ باہر دروازے کے برابر لگے ہوئے کاغذ کو ایک نظر دیکھنے کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور پیتل کی ایک سلاخ پکڑ کر تکلی اور

اپنے اسباب کا انتظار کرنے لگا۔

قلی اسباب سے لدا ہوا گاڑی کے ڈبوں کی طرف دیکھ دیکھ کر دوڑا چلا آرہا تھا۔ مسافر نے اسے دیکھا اور جھلا کر بلند آواز میں کہا: "ابے اندھے ادھر آ۔"

قلی نے مسافر کی آواز پہچان کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ مگر پھر بھی خود مسافر کو نہ دیکھ سکا۔ وہ ابھی اسی پریشانی میں تھا کہ ایک اور آواز آئی ــــ کیوں نظر نہیں آرہا کیا؟ ــــ اِدھر اُدھر ــــ ناک کی سیدھ

قلی نے مسافر کو دیکھ لیا اور اسباب لے کر اس کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔

صاحب ایک طرف ہٹ جائیے، میں اسباب اندر رکھ دوں۔"

"ہاں رکھو۔" مسافر دروازے کے قریب ایک گدے دار نشست پر بیٹھ گیا۔ مگر اتنا عرصہ سو رہے تھے کیا؟ خانساماں نے تمہیں یہ نہیں کہا تھا کہ صاحب کا سامان اٹھا کر گاڑی آتے ہی فوراً ڈبے میں رکھ دینا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کس ڈبے میں سوار ہوں گے۔ قلی نے ایک بھاری ٹرنک بالائی نشست پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارا ریزرو ہے۔ باہر چِٹ پر ہمارا نام بھی لکھا ہوا ہے۔"

آپ نے پہلے کہا ہوتا تو ہرگز دیر نہ ہوتی ــــ ایک، دو، تین ــــ آٹھ

اور یہ دس" قلی نے اسباب کی مختلف اشیاء گننا شروع کر دیں سامان فرینے سے رکھنے کے بعد قلی نے اپنے اطمینان کے لئے ایک بار پھر رکھی ہوئی چیزوں پر نگاہ ڈالی اور ڈبے سے نیچے پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔

"صاحب اپنا سامان پورا کر لیجئے۔"

مسافر نے بڑی بے پروائی سے اپنی جیب سے ایک نفیس بٹوہ نکالا اور ابھی کھول کر مزدوری ادا کرنے والا ہی تھا کہ اسے کچھ یاد آگیا۔

"ہماری چھڑی کہاں ہے؟"

"چھڑی —— چھڑی تو آپ ہی کے پاس تھی۔"

"میرے پاس کنا ہے —— وہیں چھوڑ آیا ہو گا تو۔"

چھڑی آپ کے پاس تھی —— مگر صاحب اس سخت کلامی سے پیش آنا درست نہیں۔ جب میں نے کوئی خطا نہیں کی ——"

قلی کی زبان سے اس قسم کے الفاظ سن کر مسافر آگ بگولا ہو گیا اور جگہ سے اٹھ کر دروازے کے پاس کھڑا ہو چلانے لگا۔

"سخت کلامی سے پیش آنا درست نہیں —— کسی نواب کا بچہ ہے! جتنے کی چھڑی ہے اتنی تو تیری اپنی قیمت بھی نہیں۔ چھڑی لے کر آتا ہے" یا نہیں؟ چور کہیں گا۔؟"

چور کے لفظ نے قلی کے بین ایک طوفان برپا کر دیا اس کے جی بیں آئی کہ اس مسافر کی ٹانگ پکڑ کر نیچے کھینچ لے اور اسے اس اکڑ فوں کا مزا چکھا دے۔ مگر طبیعت پر قابو پاکر خاموش ہوگیا۔ اور ترمی سے کہنے لگا آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے — چھڑی آپ نے کہیں رکھ دی ہوگی، مجھے بتائیے میں وہاں سے لے آؤں۔"

"گویا میں بے وقوف ہوں — میں کہہ رہا ہوں چھڑی لے کر آ، ورنہ ساری شیخی کرکری کر دوں گا۔"

قلی ابھی کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ اسے چند قدم کے فاصلے پر خانساماں نظر آیا جو ہاتھ میں سگریٹ کا ڈبہ اور چھڑی لیے چلا آرہا تھا

"چھڑی خانساماں لے کر آرہا ہے اور آپ خواہ مخواہ مجھ پر برس رہے ہیں۔

"بکواس مت — کتے کی طرح چلا رہا ہے۔"

یہ سن کر قلی غصے سے بھرا ہوا مسافر کی طرف بڑھا۔ مسافر نے پورے زور سے اس کے بڑھتے ہوئے سینے پر اپنے نوکیلے بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ ٹھوکر کھاتے ہی قلی چکراتا ہوا سنگین فرش پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔

قلی کو گرتے دیکھ کر بہت سے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو گئے

"بے چارے کو سخت چوٹ آئی ہے۔"

"یہ لوگ بہانہ بھی کرتے ہیں۔"

"منہ سے شاید خون نکل رہا ہے۔"

"معاملہ کیا ہے۔"

"اس آدمی نے اس بوٹ سے ٹھوکر ماری ہے۔"

"کہیں مر نہ جائے بے چارہ"

"کوئی دوڑ کر پانی کا گلاس تو لائے۔"

"بھئی ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو۔ ہوا تو آنے دو۔"

قلی کے گرد جمع ہوتے ہوئے لوگ آپس میں طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد خالد اور اس کا دوست بھیڑ چیر کر گرے ہوئے مزدور کے قریب پہنچے۔ خالد نے اس کے سر کو اپنے گھٹنوں پر اٹھالیا اور اخبار سے ہوا دینا شروع کر دی۔ پھر اپنے دوست سے مخاطب ہو کر بولا

"مسعود وحید سے کہہ دو کہ اب ہم اس سے گھر پر مل سکیں گے اور وہاں اس ظالم کو دیکھنا کہاں ہے۔ گاڑی چلنے والی ہے کہیں چلا نہ جائے"

یہ سنتے ہی لوگ اس مسافر کے ڈبے کے پاس جمع ہو گئے۔ جو کھڑکی کے پاس بیٹھا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اخبار پڑھنے کی بے سود کوشش

کر رہا تھا۔

مسعود اپنے وحید دوست سے رخصت ہو کر اس مسافر کی طرف بڑھا اور کھڑکی کے قریب جا کر نہایت شائستگی سے کہا آپ یہاں ــــ اخبار بینی میں مصروف ہیں اور وہ بے چارہ بے ہوش پڑا ہے۔"

"پھر میں کیا کر دوں"۔

"چلیے اور کم از کم اس کی حالت تو دیکھیے۔"

"کمبخت نے میرے سفر کا تمام لطف بدمزہ کر دیا اور پھر دروازے سے باہر نکلتے ہوئے۔" چلیے صاحب ــــ یہ مصیبت بھی دیکھنا تھی۔"

خالد بے ہوش قلی کا سر تھامے اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگ جھکے ہوئے خالد اور قلی کے چہرے کی طرف بغور دیکھ رہے تھے۔

"خالد آپ تشریف لے آئے ہیں" مسعود نے مسافر کو آگے بڑھنے کے لیے کہا۔"

ہاں جناب ــــ یہ ہے آپ کے ظلم کا شکار ــــ کسی ڈاکٹر کو ہی بلوا لیا ہوتا آپ نے" مسعود نے مسافر سے کہا۔

مسافر قلی کے زرد چہرے اور لوگوں کا گروہ دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوا اور گھبراتے ہوئے جیب سے اپنا بٹوہ نکالا۔

مسافر ابھی بٹوہ نکال ہی رہا تھا قلی کا جسم متحرک ہوا اور اس نے اپنی آنکھیں کھول کر ہجوم کی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔

"یہ نوٹ آپ اسے میری طرف سے دے دیجئے گا۔ میں جا رہا ہوں گاڑی کا وقت ہو گیا ہے مسافر نے مسعود کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے انگریزی زبان میں کہا اور پھر قلی کو ہوش میں آتا دیکھ کر اس سے مخاطب ہوا۔" ہم نے اس غلطی کی قیمت ادا کر دی ہے۔"

قلی یہ سن کر تڑپا منہ سے خون کی ایک دھار بہہ نکلی۔ بڑی کوشش کے بعد اس نے یہ چند الفاظ اپنی زخمی چھاتی پہ زور دے کر ادا کئے۔

میں بھی انگریزی زبان جانتا ہوں۔۔۔۔۔۔ دس روپے۔۔۔ ایک انسان کی جان کی قیمت۔۔۔۔۔۔ میرے پاس بھی کچھ ہے۔۔۔ جو۔۔۔۔

باقی الفاظ اس کے خون بھرے منہ میں بلبلے بن کر رہ گئے۔ مسافر قلی کی یہ حالت دیکھ کر اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا "میں زیادہ بھی دے سکتا ہوں۔"

قلی نے بڑی تکلیف سے مسافر کی طرف رخ پھیرا اور منہ سے خون کے بلبلے نکالتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس۔۔۔۔۔ بھی۔۔۔۔۔ کچھ ہے۔۔۔ یہ لو۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے مسافر کے منہ پر تھوک دیا۔ تڑپا اور پلیٹ فارم

کی آہنی چھت کی طرف مظلوم نگاہوں سے دیکھتا ہوا خالد کی گود میں سرد ہو گیا۔

مسافر کا منہ خونی تھوک سے رنگا ہوا تھا۔

خالد اور مسعود نے لاش دوسرے آدمیوں کے حوالے کر کے مسافر کو پکڑ کر پولیس کے سپرد کر دیا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

مسافر کا مقدمہ دو مہینے تک متواتر عدالت میں چلتا رہا۔

آخر فیصلہ سنایا گیا۔ فاضل جج نے ملزم کو تھوڑا سا جرمانہ کرنے کے بعد بری کر دیا۔ فیصلہ میں یہ لکھا تھا کہ قلی کی موت اچانک تلی پھٹ جانے سے واقع ہوئی ہے۔

فیصلہ سناتے وقت، خالد اور مسعود بھی بیٹھے۔ ملزم ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

"قانون کا قفل طلائی چابی سے کھل سکتا ہے"۔

مگر ایسی چابی ٹوٹ بھی جایا کرتی ہے۔"

"خالد اور اس کا دوست باہر برآمدے میں گفتگو کر رہے تھے۔

تحفہ

افراد

جگل .... (آواز میں بے نیازی ہو) شیلا ..... (خوش آواز لڑکی)
گنیش (تعلیم یافتہ بنیاد۔ بولنے کا چاچا تلا انداز) ایک لڑکی ... شیلا کی سہیلی
دکاندار (ان پڑھ بنیا۔ جھگڑالو قسم کا آدمی) رامو ..... (نوکر)

کالج کا گھنٹہ بجتا ہے ـــــ ساتھ ہی کئی قدموں کی آواز۔

شیلا:۔ جگل ـــــ جگل!

جگل:۔ اوہ ـــــ شیلا

شیلا:۔ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔

جگل:۔ کہو۔

شیلا:۔ میں نے بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پہ پہنچی ہوں کہ ہمارا آپس میں

ملنا ٹھیک نہیں۔ کالج میں یا کالج کے باہر، اب ہمیں ایک دوسرے
سے ملنا نہیں چاہیئے۔
جگل :۔ کیوں ؟
شیلا :۔ اس لئے کہ
جگل :۔ کہو کہو ــــ صاف صاف کہو۔
شیلا :۔ اس لئے کہ لوگ تمہیں اول درجے کا بدمعاش، آوارہ گرد ــــ
اور لچا خیال کرتے ہیں۔
جگل :۔ اہنسنا ہے اصرف خیال ہی کرتے ہیں۔ ..... انہیں اب تک
یقین ہونا چاہیئے تھا۔
شیلا :۔ جگل تم کبھی سنجیدہ ہونا بھی سیکھو گے یا نہیں۔
جگل :۔ نہیں۔
شیلا :۔ کیوں ؟
جگل سنجیدگی میں کیا دھرا ہے۔ ... یعنی خواہ مخواہ آدمی سنجیدہ ہوتا
پھرے۔ میں صحت مند ہوں اور صحت مند رہنا ہوں۔ اپنی زندگی
کو یہ روگ نہیں لگانا چاہتا۔
شیلا :۔ تم نے میرا فیصلہ سُن لیا۔
جگل :۔ سن لیا۔

شیلا:۔ تمہیں قبول ہے؟

جگل:۔ میں دوسروں کے فیصلے قبول نہیں کرتے ـــــ میں تم سے ملونگا اور ملتا رہوں گا۔

شیلا:۔ زندگی اجیرن کر دو گے میری۔

جگل:۔ (مسکرا کر) میں تمہیں اپنی زندگی دے دوں گا۔

شیلا:۔ (ازراہ مذاق) جو تمہارے اس بوٹ کی طرح گھسی ہوئی ہے۔

جگل:۔ استعمال جو زیادہ کرتا رہا ہو۔ مگر صرف اس کا تلا ہی گھسا ہے اوپر کا حصّہ بالکل ٹھیک ہے ـــ پالش کر دو گی تو چمک اٹھے گا۔

شیلا:۔ تم خود پالش کیوں نہیں کرتے؟

جگل:۔ اس لئے کہ . . . .

شیلا:۔ ٹھہرو ـــ میں اس وقت سنجیدہ ہونا چاہتی ہوں ـــ بتاؤ تم خود پالش کیوں نہیں کرتے ـــ تم اپنی اصلاح کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ لوگ تمہیں اول درجے کا آوارہ گرد سمجھتے ہیں۔ تم ان کے دماغ سے یہ خیال دور کیوں نہیں کرتے ـــ تم کیوں اتنے بے پروا ہو ـــ کیا تمہارا یہ لاابالی پن کبھی دور نہیں ہوگا۔ کیا تم کبھی انسان نہیں بنو گے۔؟

جگل:۔ آہستہ آہستہ۔

شیلا:۔ لوگ میری جان کھا گئے ہیں۔ جدھر جاتی ہوں میری طرف انگلیاں اٹھتی ہیں ـــ میرے کیرکٹر پہ حملے کئے جاتے ہیں ـــ میں سب کچھ سہتی ہوں، صرف تمہاری خاطر۔

جگل:۔ میری خاطر۔

شیلا:۔ بھگوان جانے میری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھے تم سے اتنا اُنس کیوں پیدا ہو گیا ہے ـــ میں تم سے بالکل کنارہ کش ہو جاتی۔ تمہارے خیال تک کو اپنے دل و دماغ سے محو کر دیتی۔ مگر مجھے ترس آتا ہے کہ تم اور بھی بہک جاؤ گے۔

جُگل:۔ تم مجھ پر ترس کھاتی ہو ـــ میں کوئی زخمی گدھا نہیں۔ کوئی لنگڑا کتا نہیں ـــ کوئی بیمار بھینس نہیں۔

شیلا (ذرا درشتی کے ساتھ) جُگل

جُگل:۔ بکو نہیں۔

شیلا:۔ (دھیمے لہجے میں، افسردگی کے ساتھ) جُگل۔

جگل:۔ اول درجے کا بدمعاش، شہدا۔ لُچا اور آوارہ گرد ہے۔

شیلا:۔ میں نے یہ کبھی نہیں سمجھا۔

جگل:۔ وہ اپنے بالوں میں تیل نہیں لگاتا۔ میلے کپڑے پہنتا ہے۔ اس کا جوتا ٹوٹا ہوا ہے۔

شیلا:۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا۔
جگل:۔ پہلے نہیں کہا تو اب کہہ دو ——— میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے نفرت کرو ——— ابھی، اسی وقت ——— میں چاہتا ہوں کہ تمہاری عقل درست ہو جائے اور وہ رتی بھر اُنس جو تمہارے دل میں پیدا ہو گیا ہے دور ہو جائے۔ تم مجھ سے بالکل کنارہ کش ہو جاؤ تاکہ میں اور زیادہ بہک سکوں۔
شیلا: تم کتنے بے رحم ہو۔
جگل:۔ لوگ تمہاری جان کھا گئے ہیں۔ جدھر جاتی ہو تمہاری طرف اُنگلیاں اٹھتی ہیں۔ تمہارے کیریکٹر پہ حملے کئے جاتے ہیں ——— صرف میری خاطر ——— مجھ شہدے لچّے اور آوارہ گرد کی خاطر ——— تمہارا فیصلہ، اَب مجھے منظور ہے۔ اس لئے کہ تم مجھ پہ ترس کھاتی رہی ہو ——— طبیعت پہ جبر کر کے مجھ پر رحم کرتی رہی ہو۔
شیلا: تم بہت جلد بھڑک اٹھتے ہو جگل! مجھے تم سے جھوٹ موٹ کا اُنس نہیں ہے ——— میری ہمدردی مصنوعی ہمدردی نہیں ہے ——— میں تم پہ ترس کھاتی ہوں اس لئے کہ دوسرے تم پہ ترس نہیں کھاتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم اور زیادہ بہک جاؤ۔ تمہارا وجود بالکل منتشر ہو جائے۔ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اس طور پہ کہ تم پھر انہیں اکٹھا بھی نہ کر سکو ———

میں یہ نہیں چاہتی مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں عورت ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سلامت رہو۔ وہ تمام خوبیاں جو لوگوں کے نزدیک ہیں تمہارے اندر پیدا ہو جائیں ـــ میں بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکوں ـــ جگل صاحب میرے دوست ہیں۔

جگل: (تمسخر آمیز ہنسی) جگل صاحب ـــ یہ جگل صاحب ہیں۔ شہر کے بہت بڑے رئیس ـــ بہت بڑا نام ہے آپ کا۔ آپ کی پتلون میں چار پیوند لگے ہیں۔ کوٹ آپ نے کسی دوست کا پہن رکھا ہے۔ جوتا آپ کا پھٹا ہوا ہے۔ (ہنستا ہے) یہ جگل صاحب ہیں (ہنستا ہے) جاؤ شیلا جاؤ ایک ناکارہ آدمی میں اتنی دلچسپی نہ لو ـــ پڑھو ـــ امتحان پاس کرو اور شادی کر کے اطمینان سے ایک جگہ بیٹھ جاؤ۔

(شادی کے ساتھ ہی شہنائیوں کا ریکارڈ لگا دیا جائے)

تھوڑی دیر کے بعد ہجوم کا شور پیدا کیا جائے ـــ چند لمحات بعد ان آوازوں کو دھیما کر دیا جائے اور ذیل کا مکالمہ سپرد مبونیم کیا جائے۔

ایک آدمی: ۔ کیا ہو رہا ہے بھائی یہاں ؟

دوسرا آدمی:۔ شادی بیاہ ہو رہا ہے۔

جنگل:۔ کس کا؟

پہلا آدمی:۔ تم جانتے ہو؟

جنگل:۔ مجھے کیا معلوم۔

پہلا آدمی:۔ رائے بہادر شیام سندر جی کی سپتری شیلا کا بیاہ ہے۔

جنگل:۔ کس کے ساتھ؟

پہلا آدمی:۔ رائے صاحب لالہ گنیس پرشاد جی کے ساتھ ــــــ شہر کے بہت بڑے رئیس ہیں۔ لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔

جنگل:۔ ضرور کھیلتے ہوں ــــ سگریٹ کا ایک کش مجھے بھی دینا۔

پہلا آدمی:۔ نیا لے لو۔

جنگل:۔ نہیں نہیں یہی دو ــــ تم نیا سلگا لو (ہنستا ہے) سلگے سلگائے سگریٹ مجھے اچھے لگتے ہیں اس لئے کہ سلگانے نہیں پڑتے۔

(شہنائیوں کی آواز بلند ہو کر پھر عقب میں چلی جائے۔)

جنگل:۔ بڑا جمگھٹ لگا ہے۔

پہلا آدمی:۔ برات آچکی ہے۔

جنگل:۔ چلی بھی جائے گی۔

پہلا آدمی:۔ (ہنستا ہے) تو کیا یہیں بیٹھ رہے گی ــــــ کیسی باتیں

کرتے ہو یار۔

جگل (ہنستا ہے) بس ایسی ہی باتیں کرتا ہوں۔

دوسرا آدمی:۔ یہ لڑکی کسے ڈھونڈ رہی ہے؟

جگل:۔ جانے بلا۔

پہلا آدمی:۔ تمہاری طرف دیکھ رہی ہے۔

جگل:۔ میری طرف.... ؟ (ہنستا ہے) لیکن میں تو شادی نہیں کرنا چاہتا

(تینوں ہنستے ہیں)

لڑکی:۔ آپ میں سے کس کا نام جگل ہے؟

پہلا آدمی:۔ میرا تو نہیں ہے۔ اس سے پوچھ لو۔

لڑکی (جگل سے) کیا جگل صاحب آپ ہیں؟

جگل:۔ صاحب کوئی اور ہوگا۔ میں صرف جگل ہوں۔

لڑکی:۔ چلئے ۔۔ آپ کو اندر بلایا ہے۔

جگل:۔ کس نے؟

لڑکی:۔ آپ چلئے میں بتاتی ہوں۔

جگل:۔ کیا میرا چلنا ضروری ہے۔

لڑکی:۔ جی ہاں۔

جگل:۔ (اپنے ساتھیوں سے) اچھا بھئی رخصت چاہتا ہوں۔ سگریٹ

کا شکریہ۔

پہلا آدمی:۔ (ازراہ مذاق) ایک اور لیتے جاؤ شاید اندر ضرورت پڑے۔

جگل:۔ (ہنستا ہے) نہیں پڑے گی۔

(شہنائیوں اور ہجوم کا شور عقب سے ابھر آئے اور چند لمحات کے بعد دب جائے)

جگل:۔ آپ نے مجھے بلایا ہے —— فرمائیے؟

شیلا:۔ (اضطراب بھرے لہجے میں) تم نے مجھے آپ کیوں کہا؟

جگل:۔ دیر کے بعد ملاقات ہوئی اس لئے یہ اجنبیت پیدا ہو گئی۔

شیلا:۔ تم ابھی ویسے کے ویسے ہو۔

جگل:۔ جی ہاں ابھی تک ویسے کا ویسا ہوں۔ کیا جناب کو کوئی اعتراض ہے۔

شیلا:۔ (اور زیادہ مضطرب ہو کر) یہ آداب کس لئے؟

جگل:۔ آپ کے شاندار لباس سے مرعوب ہو گیا ہوں۔

شیلا:۔ (تنگ آکر) آہ تم مجھے دیوانہ بنا دو گے۔ مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔ میں نے تمہیں یہاں اس لئے بلایا تھا کہ میں تم سے بے شمار

باتیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اب مجھے ایک بھی یاد نہیں آتی۔ تمہارے اس عجیب و غریب لہجے نے مجھے سب کچھ بھلا دیا ہے ——— بتاؤ مجھے کیا کہنا تھا ——— ؟

جگل :۔ مجھے کیا معلوم ؟

شیلا :۔ تمہیں سب معلوم ہے۔ تم سب کچھ جانتے ہو ——— جلدی کرو۔ میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ بتاؤ ——— بتاؤ۔ میں تم سے کیا کہنا چاہتی تھی ——— بتاتے کیوں نہیں ؟

جگل مجھے کیا معلوم ؟

شیلا :۔ تم ——— تم ——— تمہاری صحت کیسی ہے۔ ؟ ——— تم بہت دبلے ہو گئے ہو۔ میں، میں بالکل اچھی ہوں! لیکن تم ——— (اٹک اٹک کر) نہیں۔ میں کچھ اور ہی پوچھنا چاہتی تھی (باہر سے کسی عورت کی آواز آتی ہے۔ شیلا) ——— دیکھا ——— وقت ہو گیا ——— تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا ——— اور مجھے بے شمار باتیں کہنا تھیں۔

جگل :۔ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔

شیلا :۔ ہاں ——— ہاں ——— مجھے تم سے یہ بھی کہنا تھا۔

(دستک ہوتی ہے)

شیلا :۔ (دھیمی آواز میں) ٹھہرو . . . (جگل سے) کچھ اور بھی کہو۔

جگل :- کیا کہوں -

(دستک ہوتی ہے)

شیلا :- آئی ــ توبہ ، دستک سے دیکر دروازہ توڑ دیا ہے (جگل سے)

جگل اب تم جاؤ - کیا کروں مجبوری ہے ــ لیکن دیکھو کبھی کبھی مجھ سے

ملنے کے لیے ضرور آیا کرنا ــ ضرور ــ ضرور ــ ادھر سے ....

(دروازہ کھولنے کی آواز)

شیلا :- مجھے بھولنا مت ــ سنتے ہو - مجھے بھول نہ جانا -

(شہنائیوں اور ہجوم کی آواز ابھر کر اونچی ہو جاتی ہے - چند لمحات

کے بعد فیڈ آؤٹ -

گنیش :- شیلا -

شیلا :- جی

گنیش :- تمہارے البم میں یہ تصویر کس کی ہے -

شیلا :- ٹھہریئے میں آکے بتاتی ہوں -

(قدموں کی آواز)

شیلا :- یہ ؟

گنیش :۔ کس کی ہے؟
شیلا :۔ جگل صاحب کی۔
گنیش :۔ وہ کون
شیلا :۔ آپ نہیں جانتے ۔۔۔ کالج میں یہ ہمارے ساتھ پڑھا کرتے تھے
گنیش :۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہے۔
شیلا :۔ دیکھا ہوگا۔
گنیش :۔ ہو سکتا ہے مگر میں نے اسے اچھی طرح دیکھا تھا اس لئے کہ اس کا لباس اور اس کی وضع قطع ....

(گھڑی چار بجاتی ہے)

شیلا :۔ لیجئے چار بج گئے ۔۔۔ اب کیا خاک تیاری ہو گی مجھ سے اور ہمیں ٹھیک پانچ بجے وہاں پہنچنا ہے ۔۔۔ ایم کو چھوڑ بیئے اور موٹر نکلوانے کے لئے کہئے۔
گنیش :۔ تمہیں ساڑھی تبدیل کرنا تھی
شیلا :۔ یہی ٹھیک ہے ۔۔۔ ساڑھی تبدیل کروں گی تو ساری چیزیں بدلنا پڑیں گی ۔۔۔ نیا بلاؤز ۔۔۔ نیا پیٹی کوٹ اور پھر یہ سینڈل بھی تو اتارنا پڑے گی ۔۔۔ یہی ٹھیک ہے۔
گنیش :۔ لیکن اتنی جلدی کیا ہے۔

شیلا:۔ واہ ــــ مجھے راستے میں ایک دو سہیلیوں سے بھی تو ملنا ہے ــ
چلئے ــ چلئے۔
(قدموں آواز۔ بعد میں موٹر کی آواز)

ایک دم ہجوم کا شور سنائی دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ شور کے اس ٹکڑے پر ذیل کا مکالمہ سُپرامپوز کیا جائے)

دکاندار:۔ نہیں صاحب اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ ایسے ہزاروں گھِسے مجھے دے چکا ہے۔

ایک آدمی:۔ ایک بار اور دیکھ لو۔

دکاندار:۔ کیا دیکھ لوں ــــ اب کا گیا چھ مہینے اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔ یہ تو اتفاق سے میری نظر پڑ گئی ورنہ کبھی ہاتھ نہ آتا

دوسرا آدمی:۔ تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو۔

دکاندار:۔ پکڑ کر تھانے میں لے جاؤں اور کیا کھڑا سالے کا منہ دیکھتا رہوں گا۔

(موٹر کے ہارن کی آواز)

دکاندار:۔ آپ لوگ جائیے ــــ کیا کوئی تماشہ ہے۔

تیسرا آدمی:۔ تماشا ہی تو ہے۔ تم اس سے اپنے روپے مانگتے ہو۔ یہ کہتا ہے میرے پاس نہیں۔ تم کہتے ہو نہیں ہیں۔ نہیں مانتا تمہارے پاس ہوں نہ

ہوں ابھی نکال کر دو۔

(بہت سے آدمی ہنستے ہیں)

دکاندار:۔ تو کیا کروں ––– پھر بھاگ جائے گا ––– کیا ساری عمر اسی کو ڈھونڈتا رہوں گا؟

پہلا آدمی:۔ ارے بھائی تم نے کیوں قرض لیا تھا۔ اب دیکھو کتنی خفت اٹھانی پڑ رہی ہے تمہیں۔

(موٹر کے ہارن کی آواز)

دوسرا آدمی:۔ بھئی راستہ سے تو ہٹ جاؤ۔

دکاندار:۔ آپ لوگ ہٹ جائیں۔ میں تو یہیں کھڑا رہوں گا۔ اس کا گریبان پکڑے۔

تیسرا آدمی:۔ یہ کیسا آدمی ہے خود کچھ بولتا ہی نہیں۔

دکاندار:۔ کیا بولے گا ––– روپیہ دینا ہے اور ہر حالت میں دینا ہے۔

(موٹر کے ہارن کی آواز۔ بالکل قریب)

:۔ راستے سے ہٹو گے یا موٹر اوپر چڑھا دوں ––– بازار کے عین بیچ میں تماشا لگا رکھا ہے۔

(ہجوم کا شور)

شیلا:۔ (گھبرا کر) چلئے اب راستہ صاف ہو گیا۔

گنیش:۔ ٹھہرو۔۔۔۔۔(بلند آواز میں) اے ــــ ذرا ادھر آؤ۔

دکاندار:۔ مجھے بلایا ہے سیٹھ صاحب؟

گنیش:۔ کیا بات ہے؟

دکاندار:۔ روپیہ لینا ہے سیٹھ صاحب، چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ برابر مجھے گھسے دیئے چلا جا رہا ہے۔ آج دیتا ہوں۔ کل دیتا ہوں۔ بس اس طرح چھ مہینے گذر گئے ہیں۔

گنیش:۔ کتنی رقم نکلتی ہے تمہاری اس کی طرف۔

دکاندار:۔ سوا نو روپے۔

گنیش:۔ بس۔۔۔۔(وقفہ) لو یہ دس روپیہ کا نوٹ۔

شیلا:۔ (اضطراب کے لہجے میں) آپ کیوں کسی کا قرض ادا کرتے ہیں ــــ وہ خود ادا کرے۔

گنیش:۔ کہاں سے ادا کرے گا۔۔۔۔(دکاندار سے) سوا نو روپے کہے تھے نا تم نے۔

دکاندار:۔ جی ہاں۔

گنیش:۔ بارہ آنے بچیں گے۔ یہ تم اسے دے دینا۔

شیلا:۔ (قریب قریب چیخ کر) آپ نوٹ واپس لیجئے ــ آپ زبردستی بھیک دے رہے ہیں۔۔۔۔

(موٹر اسٹارٹ ہوتی ہے)

پہلا آدمی:- یہ کون تھے؟

جگل:- (زہر خند کے ساتھ) تم نہیں جانتے یہ کون تھے۔ یہ شہر کے بہت بڑے رئیس تھے۔ رائے صاحب لالہ گنیس پرشاد — لاکھوں میں کھیلتے ہیں — تم نے یہ دیکھا نہیں تھا کہ ان کی پتلون میں ایک بھی پیوند نہیں تھا۔ کوٹ ان کا اپنا تھا۔ جوتا بالکل نیا تھا۔۔۔۔

دکاندار:- لو یہ بارہ آنے۔

جگل:- لاؤ — میری جیب بالکل خالی تھی۔

(ہجوم کا شور — چند لمحات کے بعد فیڈ اپ)

آہستہ آہستہ ذیل کی غزل کی دھن شروع ہو — سازوں پر پھر شعر گائے جائیں۔

غزل

غم کی دنیا بسا رہی ہوں میں
ان کو اپنا بنا رہی ہوں میں
سازِ ہستی کے تار ٹوٹ نہ جائیں
نغمۂ دل سنا رہی ہوں میں
سعیِ ناکام کے چراغوں کو
آندھیوں میں جلا رہی ہوں میں

(بقیہ)

(چند لمحات تک سازوردناک سے میں بجتے رہیں)

گنیش:۔ شیلا

شیلا (افسردگی کے ساتھ) جی

گنیش:۔ تمہارے البم سے وہ تصویر کہاں گئی۔

شیلا:۔ وہ جو آپ نے اس روز دیکھی تھی۔

گنیش:۔ ہاں وہی۔

شیلا:۔ نکال دی ہے۔

گنیش:۔ کیوں؟ ..... بڑی اچھی تصویر تھی۔

شیلا۔ (لہجے میں دبے ہوئے صدمے کے آثار نظر آتے ہیں) اچھی ہی تھی۔

گنیش:۔ تو نکال کیوں پھینکی۔؟

شیلا:۔ نکالی ہے۔ پھینکی نہیں؟

گنیش:۔ میرا مطلب یہی تھا۔

شیلا:۔ اچھا۔

گنیش:۔ تمہاری طبیعت کئی دنوں سے سست ہے ۔۔۔ غالباً اسی دن سے جب ہم موٹر میں باہر گئے تھے۔

شیلا:۔ جی ہاں۔ اسی دن سے سست ہے۔ ہوا لگ گئی تھی۔

گنیش:۔ مجھے یاد آیا۔ اس روز واقعی ہوا بہت تیز تھی۔

شیلا:۔ سرد بھی۔

گنیش:۔ سرد۔۔۔ یہ ہوا بعض اوقات بہت تیز اور سرد ہو جاتی ہے۔

شیلا:۔ جی ہاں۔

گنیش:۔ شیلا۔ اپنے اس دوست کی کچھ باتیں تو سناؤ۔ تمہاری طبیعت بہل جائیگی

شیلا:۔ کیا سناؤں؟

گنیش:۔ کچھ بھی — تصویر سے آدمی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ کیا نام بتایا تھا

شیلا:۔ جگل صاحب۔

گنیش:۔ جگل صاحب (صاحب پہ زور دے کر) آپ کی کوئی خاص خوبی۔

شیلا:۔ آوارہ مزاجی۔

گنیش:۔ (ہنستا ہے) مذاق کرتی ہو۔

شیلا:۔ (انتہائی سنجیدگی کے ساتھ) مذاق نہیں کرتی۔ جگل صاحب کی سب سے بڑی خوبی ان کی آوارہ مزاجی ہے۔ ان کا لاابالی پن!

گنیش:۔ تو وہ ایک نہیں کئی خوبیوں کے مالک ہیں۔

شیلا:۔ جی ہاں — وہ بے حد مفلس — انتہا درجے کے غلاظت پسند۔ بدتمیز ادب آداب سے ناواقف (آواز گلوگیر ہو جاتی ہے) بدزبان اور ذلت پسند ہیں۔

گنیش: تم صریحاً مذاق کر رہی ہو میں ہرگز ماننے کے لئے تیار نہیں۔

شیلا:۔ (تلخ لہجے میں) مذاق آپ کر رہے ہیں۔

گنیش: تمہاری سالگرہ کی خوشی میں آج شام کو ایک دعوت کر رہا ہوں۔
تم جنگل صاحب کو بلا لو۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔

شیلا:۔ (ایک دم بھڑک اٹھتی ہے) بس بس ــــ اب آپ میری آتما کو دکھ نہ دیجئے۔ بہت زہریلی سوئیاں آپ مجھے چبھو چکے ہیں۔ . . (روتی آواز میں) اچی بھر کے آپ نے مجھے ذلیل کر لیا ــ کیا ابھی تک کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا جو کچھ آپ چاہتے تھے میں نے کہہ دیا ہے ــ آپ نے کہلوا لیا ہے ــ اب آپ اور کیا چاہتے ہیں۔ وہ بدمعاش ہے لچا ہے۔ آوارہ گرد ہے انسانیت کے دامن پر بدنما دھبہ ہے ــــ قابل نفرت انسان ہے کچھ اور کہوں یا اتنا ہی کافی ہے۔

گنیش:۔ (نپے تلے انداز میں) اتنا کافی نہیں ہے۔ آج شام کو وہ دعوت میں ضرور شریک ہوں گے۔

شیلا:۔ میں اسے ہرگز نہیں بلاؤں گی۔

گنیش:۔ مجھے معلوم تھا۔ اس لئے میں نے خود ان سے آنے کو کہا اور انھوں نے کمال عنایت سے میری درخواست قبول کر لی۔

شیلا:۔ (سخت گھبراہٹ کے ساتھ) وہ آئے گا۔ نہیں نہیں ــ وہ کبھی نہیں

آئے گا — اگر وہ آئے گا تو آپ مجھے نہ موجود پائیں گے۔

گنیش :- میں اس کا انتظام بھی کروالوں گا (ہنستا ہے)... آج شام کو پانچ بجے تم دونوں دعوت میں شریک ہوں گے۔

(گھڑیال کے الارم کی کھڑکھڑاہٹ۔ پانچ بجنے کی آواز اور ساتھ ہی ہجوم کا شور)

ایک مہمان :- رائے صاحب بڑے ٹھاٹ کی دعوت کی ہے۔

گنیش :- لالہ جی! شیلا کی سالگرہ ہو اور یہ ٹھاٹ نہ کیے جائیں (مسکرا کر) کیوں شیلا؟

شیلا :- اتنا اہتمام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔

گنیش :- (مسکرا کر) صرف تمہاری خاطر؟

دوسرا مہمان :- رائے صاحب — اب کس کا انتظار ہے دعوت شروع ہو

گنیش :- سب مہمان آچکے ہیں سوائے ایک کے۔ ان کے بغیر پروگرام شروع نہیں ہو سکتا۔

دوسرا مہمان :- کون ہیں یہ مہاشے؟

گنیش :- شیلا کے کالج کے زمانے کے دوست — جگل صاحب

ابھی تک آئے نہیں شیلا؟

شیلا:۔ آہی جائیں گے۔

(موٹر کے ہارن کی آواز)

تیسرا مہمان:۔ یہ کون آیا؟

دوسرا مہمان:۔ آگے بڑھ کے دیکھ لو۔

تیسرا مہمان:۔ آج کل تو بہت زیادہ قیمت ہوگی اس کی۔

(قدموں کی آواز)

رامو:۔ سرکار۔ جگل صاحب تشریف لائے ہیں۔

گنیش:۔ آ گئے؟

رامو:۔ ہاں سرکار آ گئے۔

گنیش:۔ انہیں اندر لے آؤ ـــــ رامو

(قدموں کی آواز، مائکروفون کی طرف)

گنیش:۔ (حیرت کے ساتھ) یہ کون ہے؟

(قدموں کی آواز قریب تر آجاتی ہے)

جگل:۔ (باوقار، شگفتہ اور باتمیز لہجے میں) اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ میں سے کون صاحب ہیں۔

شیلا:۔ جگل۔ . . . . . تم . . . . تم . . . . ؟

جگل :۔ اوہ ۔۔۔۔ شیلا ۔۔۔۔ بھئی پہلے مجھے اپنے پتی سے متعارف کراؤ۔ جنھوں نے مجھے یہاں مدعو کیا۔

گنیش :۔ ۔۔۔۔ میں حاضر ہوں ۔

جگل :۔ پہلے آپ میرا شکریہ قبول کیجئے کہ آپ نے مجھے اس شاندار دعوت میں شریک کیا۔ آپ نے جو آدمی میرے پاس بھیجا تھا میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ بے حد مصروف ہونے کے باوجود میں ضرور آؤں گا۔ شیلا تمہارے رائے صاحب بڑے ہی اچھے آدمی ہیں۔ تم بہت خوش نصیب ہو ۔۔۔ کیوں جناب میں غلط کہہ رہا ہوں ؟

گنیش :۔ (چونک کر) کیا کہا آپ نے ۔

جگل :۔ (ہنستا ہے) حد ہو گئی ہے ۔۔۔ شیلا مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے ۔۔۔ دراصل ۔ جائداد کے انتظام اور دوسرے کاموں میں اس قدر مشغول رہا کہ سب کچھ بھول گیا (ہنستا ہے) دولت کمانا اور اس کو سنبھالنا بہت بڑی دردسری ہے ۔۔۔ تمہاری صحت تو اب اچھی ہے ۔

شیلا :۔ (خاموش رہتی ہے)

جگل :۔ رائے صاحب۔ یہ آپ نے شیلا کو کیا کر دیا ہے۔ کچھ بولتی ہی نہیں ۔۔۔ بالکل گونگی ہو گئی ہے ۔۔۔ اور آپ ۔۔۔۔۔

گنیس:۔ میں ——— میں ۔۔۔۔۔!

جگل:۔ جی ہاں آپ کیا سوچ رہے ہیں ——— ذرا ہنگامہ شروع ہو ——— میرے پاس وقت بہت کم ہے جو پروگرام آپ نے بنایا ہے۔ بس اب شروع ہو جائے ——— ہاں بھئی شیلا ——— میں تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں۔

شیلا:۔ (مردہ آواز میں) تحفہ

جگل:۔ میرا خیال ہے کہ میں تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں ——— رائے صاحب آپ پروگرام شروع نہیں کرتے ——— اب دیر کیا ہے۔

(مکمل خاموشی)

جگل:۔ یہ خاموشی کیوں؟

(وقفہ)

جگل:۔ آپ نہیں شروع کرتے تو لیجئے۔ میں شروع کرتا ہوں (بلند آواز لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے) حضرات سنیئے!

(ہجوم کی سرگوشیاں)

جگل:۔ (تقریر کے انداز میں) رائے صاحب لالہ گینڈل پرشاد جی نے آپ کو ایک بندر کا تماشا دکھانے کا انتظام کیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ بندر نہیں آیا ——— اس کے بدلے میں آگیا۔ ۔۔۔۔

(ہجوم کی سرگوشیاں)

جگل:۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں پندرہ نہیں ہوں خوش پوش انسان ہوں۔ آپ نے میرا لباس یقیناً پسند کیا ہوگا۔ وہ موٹر کار بھی پسند کی ہوگی جو ابھی تک باہر کھڑی ہے۔۔۔ میری گفتگو بھی آپ کو ضرور بھاتی ہوگی۔۔۔ یہ میری سونے کی گھڑی۔۔۔ یہ ہیرے کی انگوٹھی، بہت قیمتی ہے۔ لیکن آپ کی نگاہوں نے تو میری ہر چیز کو تول لیا ہوگا اور اس کی قیمت بھی مقرر کر لی ہوگی (لہجے میں طنز پیدا ہو جاتا ہے) آپ سب شریف آدمی ہیں۔۔۔ میں بھی شریف آدمی ہوں۔ اس لئے کہ میرا لباس اچھا ہے۔ میری موٹر اچھی ہے انگوٹھی اچھی ہے۔

گنیش: مسٹر جگل

جگل:۔ خاموش رائے صاحب خاموش جب ایک شریف آدمی بات کر رہا ہو تو اسے بیچ میں نہیں ٹوکنا چاہیئے۔۔۔ یہ گنوار پن ہے۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اور میرے پاس وقت بہت کم ہے مجھے ایک بہت ضروری کام پر جانا ہے۔ میں آوارہ گرد، لچا، بدمعاش اور ذلیل انسان نہیں ہوں اس لئے کہ میں مفلس نہیں۔ میرے پاس بے شمار دولت ہے (ہنستا ہے) بے شمار دولت۔ اتنی کہ مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔۔۔ دولت بڑی اچھی چیز ہے۔ یہ نہ ہو تو آپ کیا ہیں۔۔۔۔ محض بندہ۔

(ہجوم کا شور)

جنگل:۔ خاموش..... اگر دولت نہ ہوتی تو آپ سب بندر ہوتے۔
لوگ ڈگڈگیاں بجا کر آپ کو نچاتے ــــ آپ کے دماغوں میں بھُس
بھرا ہے لیکن آپ عقل مند ہیں۔ صرف دولت کی وجہ سے ــــ آپ
بدشکل ہیں۔ آپ کی توندیں ابھری ہوئی ہیں لیکن آپ خوبصورت ہیں
خوبصورت بیوی کے شوہر ہیں۔ اس لئے کہ آپ دولت مند ہیں۔ آپ
بھری محفل میں ڈکاریں لیں۔ میز پر ننگی ٹانگیں رکھ کر بیٹھ جائیں۔ جماہیوں
پر جماہیاں لیں لیکن آپ کو بدتمیز نہیں کہے گا۔ آپ بڈھے ہو کر جوان
ہو سکتے ہیں۔ لیکن جن کے پاس دولت نہیں وہ جوانی میں بھی جوان
نہیں ہو سکتے ــــ دولت عجیب و غریب چیز ہے۔

آپ اپنی منحوس اور بھیانک شکل کی تعریف میں شاعروں سے
قصیدے لکھوا سکتے ہیں ــــ بڑے بڑے آرٹسٹوں سے اپنی تصویر
کھچوا سکتے ہیں۔ خوبصورت عورتوں سے رومان لڑا سکتے ہیں ــ دولت
عجیب و غریب چیز ہے (ہنستا ہے) دولت عجیب و غریب چیز ہے۔
(ہنستا ہے) میں بھی دولت مند ہوں ــــ بڑا دولت مند (دیوانہ وار
ہنستا ہے ــــ ہنستے ہنستے آخر میں آواز بالکل کمزور مردہ ہو جاتی ہے)
بہت بڑا دولت مند۔

شیلا:۔ (ایک دم چیخ کر) جگل ۔۔۔ جگل

(جگل کے گرنے کی آواز۔ ہجوم کا شور۔)

شیلا:۔ بھاگ کر جگل کے پاس جاتی ہے) جگل ـــ جگل ـــ یہ کیا ہوگیا تمہیں ـــ گر کیوں پڑے ـــ سنتے ہو؟

جگل:۔ (کمزور سی آواز میں۔ کمزور ہنسی کے ساتھ) میں بہت بڑا دولت مند ہوں بہت بڑا ـــ آٹھ روز سے میں نے کچھ نہیں کھایا اور دو مہینے سے بیمار ہوں ـــ رائے صاحب، آٹھ روز سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔ کہاں ہیں رائے صاحب

شیلا:۔ (گلوگیر آواز میں) جگل۔۔۔۔۔۔۔۔

جگل:۔ شیلا! جگل نہیں جگل صاحب کہو ـــ ان لوگوں سے فخر کے ساتھ کہو جگل صاحب ہیں ـــ میرے دوست ـــ ان کی تپلون اپنی نہیں کوٹ، قمیص، ٹائی، جوتا، انگوٹھی، گھڑی ـــ ان میں سے کوئی چیز بھی ان کی نہیں ـــ یہ سب چیزیں اس کی ہیں جو نیچے اپنی موٹر میں میرا لباس پہنے بندھا پڑا ہے۔ جانے کون گدھا ہے ـــ لیکن ہے دولت مند (ہنستا ہے)

شیلا:۔ تم نے کیا کیا جگل!

جگل:۔ (مسکرا کر) ایک تماشے کے بدلے دوسرا تماشا ـــ کیا میں اس

لباس میں شریف اور مہذب انسان دکھائی نہیں دیتا۔ کیا ہوا جو مجھے آٹھ روز سے کھانے کو نہیں ملا — کیا ہوا اگر ضعف کے باعث میری زندگی ختم ہو رہی ہے — کیا ہوا — ایک آوارہ گرد کم ہو جائے گا۔ ایک ناکارہ انسان یہاں سے دفع ہو جائے گا — اچھا شیلا میں اب جاتا ہوں —

شیلا:۔ کہاں۔

جگل:۔ موت نے بلا بھیجا ہے — وہاں بھی شاید ایسی دعوت ہو گی۔

شیلا:۔ (گلوگیر آواز میں) میرا تحفہ

جگل:۔ تمہارا تحفہ — ہاں تمہارا تحفہ — میرا سب کچھ تو نیچے موٹر میں پڑا ہے۔

(وقفہ تمہارے اس نوکر کا کیا نام ہے)

شیلا:۔ رامو۔

جگل:۔ رامو! ذرا آگے آؤ — آ جاؤ ڈرو نہیں۔

(وقفہ)

جگل:۔ اس کی آنکھوں میں تمہیں دو میلے آنسو نظر آ رہے ہیں؟

شیلا:۔ آ رہے ہیں۔

جگل:۔ یہی آنسو میرا تحفہ ہیں جو یہاں کسی اور کی آنکھوں میں نظر نہیں آتے

میں نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی چیز تمہیں دے دی ہے۔
رامو بیڑی ہے تمہارے پاس۔؟

رامو:۔ ہے سرکار
جگل:۔ ایک سلگا کر مجھے دو۔

(ماچس کی کھڑکھڑاہٹ)

جگل:۔ (بالکل دھیمے لہجے میں) آوارہ گرد۔ لُچّا۔ بدمعاش۔

(آواز بالکل ڈوب جاتی ہے)

رامو:۔ لیجئے سرکار بیڑی۔
جگل:۔ (سرگوشی میں۔ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ) سرکار۔۔۔۔
شیلا:۔ (ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی ہے) جگل۔۔
۔۔۔۔جگل۔۔۔۔

(سسکیاں۔ فیڈ آؤٹ)

مسز ڈی سلوا

بالکل آمنے سامنے فلیٹ تھے۔ ہمارے فلیٹ کا نمبر تیرہ تھا۔ اس کے فلیٹ کا چودہ۔ کبھی کوئی سامنے کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہو تو مجھے یہی معلوم ہوتا کہ ہمارے دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔ اس غلط فہمی میں جب سے ایک بار دروازہ کھولا تو اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔

یوں تو اس سے پہلے کئی دفعہ میں اُسے سیڑھیوں، بازار میں اور بالکونی میں دیکھ چکی تھی۔ مگر کبھی بات کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور کہنے لگی "تم نے سمجھا کوئی تمہارے گھر آیا ہے۔" میں بھی جواب میں مسکرا دی۔ چند لمحات تک وہ اپنے دروازے کی دہلیز میں اور میں اپنے دروازے کی دہلیز میں کھڑی رہی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے اور میں اُس سے اچھی طرح واقف ہو گئی۔

اس کا نام میری، خدا معلوم کیا تھا مگر اس کے خاوند کا نام پی ۔ این ۔ ڈیسلوا تھا۔ چنانچہ میں اسے مسز ڈی سلوا ہی کہتی تھی۔ میں اسے میری ضرور کہتی مگر وہ عمر میں مجھ سے کہیں بڑی تھی۔ موٹے موٹے نقش چھوٹی گردن، اندر دھنسی ہوئی ناک پکوڑا سی۔ سر چھوٹا جس پہ کٹے ہوئے بال ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ آنکھیں دوات کے منہ کی طرح کھلی رہتی تھیں۔ معلوم نہیں سوتے میں ان کی شکل کیسی ہوتی ہوگی۔

اس کا خاوند معمولی شکل وصورت کا آدمی تھا۔ کسی دفتر میں کام کرتا تھا جب شام کو گھر لوٹتا اور مجھے باہر بالکنی میں دیکھتا تو اپنے بھورے رنگ کا ہیٹ اتار کر مجھے سلام ضرور کرتا تھا۔ بے حد شریف آدمی تھا۔ مسز ڈی سلوا بھی بہت ملنسار اور با اخلاق عورت تھی۔ دونوں میاں بیوی پر سکون زندگی بسر کرتے تھے۔

چار پانچ برس کا ایک لڑکا تھا اس کو دیکھ کر کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باپ چھوٹا ہوگیا ہے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماں سکڑ گئی ہے۔ ماں باپ دونوں کے نقش کچھ اس طرح اس بچے میں خلط ملط ہو گئے تھے کہ آدمی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ماں پہ ہے یا باپ پر۔

پانچ برس میں ان کے یہاں صرف یہی ایک بچہ ہوا تھا۔ مسز ڈی سلوا نے ایک روز مجھ سے کہا تھا۔ "ہمارا ماں بھی اس ایچ دیا کرتا تھا۔۔۔۔۔۔ پانچ

برس کے پیچھے ایک پہلے ہم ہوا۔ پانچ برس کے پیچھے ہمارا بھائی ہوا ——
اس کے پیچھے ہمارا ایک اور بہن۔"

پانچ برس کی قید چونکہ پوری ہو چکی تھی۔ اس لئے مسز ڈی سلوا اب پیٹ سے تھی۔ اس کا خاوند بہت خوش تھا۔ مجھے مسز ڈی سلوا نے بتایا کہ اپنی ڈائری میں اس نے کئی تاریخیں لکھ رکھی ہیں۔ پہلے بچے کی پیدائش کی تاریخ —— ہونے والے بچے کی پیدائش کی تاریخ کا اندازہ اور وہ سال جس میں کہ تیسرا بچہ پیدا ہوگا۔۔۔ یہ سارا حساب اس نے اپنی ڈائری میں درج کر رکھا تھا۔ مسز ڈی سلوا کہتی تھی کہ اس کے خاوند کو پانچ برس کی یہ قید اچھی معلوم نہیں ہوتی اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک بچہ پیدا کرنے کے بعد وہ پانچ برس کے لئے کیوں چھٹی پر چلا جاتی ہے۔ مسز ڈی سلوا خود حیران تھی مگر اُسے فخر بھی تھا کہ وہ ماں کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے۔

میں بھی کم متحیر نہ تھی۔ سوچتی تھی۔ یا الٰہی یہ پانچ برسوں کا چکر کیا ہے۔ کیوں ان دونوں میں سے ایک گنتی نہیں بھول جاتا ہے۔۔۔ قدرت نے اس عورت کے اندر ایسی مشین لگا دی ہے کہ جب پانچ سال کے پانچ چکر ختم ہو جاتے ہیں تو کھٹ سے بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ ہمارے پڑوس میں ایک عورت تھی جو ڈیڑھ برس سے پیٹ سے تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ اس کے رحم میں کوئی ہے بچہ موجود ہے جو پیدا ہو جائے گا۔ مگر اس کی نشوونما

تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چونکہ رک جاتی ہے۔ اس لئے ابھی تک اتنا بڑا نہیں ہوا کہ پیدا ہو سکے۔

امی جان جب مجھ سے یہ باتیں سنتی تھی تو کہا کرتی تھیں۔ قیامت آنے والی ہے۔ خدا جانے دنیا کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے کبھی ایسی باتیں سننے میں نہیں آتی تھیں عورتیں چپ چاپ نو مہینے کے بعد بچے جن دیا کرتی تھیں۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ اب کسی کے بچہ ہونے والا ہو تو سارے شہر کو خبر ہو جاتی ہے۔ مٹکا سا پیٹ لئے باہر جا رہی ہیں۔ سڑکوں پر گھوم رہی ہیں۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ مگر کیا مجال کہ ان کو ذرا سی بھی حیا آ جائے۔۔۔ آج کل تو دیدوں کا پانی ہی مر گیا ہے۔

میں یہ سنتی تھی تو دل ہی دل میں ہنستی تھی۔ امی جان کا پیٹ بھی کئی بار پھول کر مٹکا بن چکا تھا اور یہ مٹکا لئے وہ گھر کا سارا کام کاج کرتی تھیں۔ ہر روز مارکیٹ جاتی تھیں۔ مگر جب دوسروں کو دیکھتی تھیں۔ یا ان کے متعلق باتیں سنتی تھیں تو اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دکھتی تھیں۔ دوسروں کی آنکھ کا تنکا انہیں فوراً نظر آ جاتا تھا

آدمی اگر اس مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو کیا اسے باہر آنا جانا بالکل بند کر دینا چاہیے۔ مٹکا سا پیٹ لئے بس گھر میں بیٹھے رہو۔ صوفے پر اٹھو چارپائی لیٹ جاؤ۔ چارپائی سے اٹھو تو کسی کرسی پر لیٹ جاؤ۔ مگر آفت تو یہ ہے کہ مٹکا سا پیٹ لئے بیٹھنے اور لیٹنے میں بھی تو تکلیف ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے

کہ آدمی چلے پھرے تاکہ بوجھ کچھ ہلکا ہو یہ کیا کہ پیٹ میں ٹبا سا فٹ بال ڈالے گھر کی چار دیواری میں قید رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ امی جان جیا کیوں ظاہر کرنا چاہتی ہیں۔ بھئی اگر کوئی پیٹ سے ہے تو کیا اس کا قصور ہے؟ اس نے کوئی شرمناک بات کی ہے۔ جو وہ شرم محسوس کرے۔

جب خدا کی طرف سے یہ مصیبت عورتوں پر عائد کر دی گئی ہے کہ وہ ایک مقررہ مدت تک بچے کو پیٹ میں رکھیں تو اس میں شرمانے اور لجانے کی بات ہی کیا ہے اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ سب کام چھوڑ کر آدمی بالکل نکما ہو جائے اس لئے کہ اسے بچہ پیدا کرنا ہے۔ بچہ پیدا ہونا ہے اب کیا اس کے لئے باہر آنا جانا موقوف کر دیا جائے لوگ ہنستے ہیں تو ہنسیں کیا ان کے گھر میں مائیں اور بہنیں کبھی پیٹ سے نہیں ہوں گی۔ بھئی، مجھے تو امی جان کی یہ منطق بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ اصل میں ان کی عادت یہ ہے کہ خواہ مخواہ ہر بات پر اپنا لکچر شروع کر دیتی ہیں۔ خواہ کسی کو بُرا لگے یا اچھا اپنی لڑکی کی بات ہو تو کبھی کچھ نہ کہیں گی۔ پچھلی دفعہ جب عارف میرے پیٹ میں تھا اور میں ہر روز پابندی سے ہر کو جاتی تھی تو قسم لے لو جو ان کے منہ سے میرے خلاف کچھ نکلا ہو۔ پر اب چونکہ بات مسز ڈی سلوا کی تھی جو بیچاری صرف اتوار کی صبح گرجا میں نماز پڑھنے اور شام کو سودا سلف لانے کے اپنے خاوند کے ساتھ باہر نکلتی تھی۔ اس لئے امی جان کو تو "یہ ہے بیوی، تو یہ ہے بیوی"

کھنے کا موقع مل جاتا ہے۔

پہلے بچے پر پیٹ زیادہ نہیں پھولتا۔ لیکن دوسرے بچے کو چونکہ پھیلنے کے لئے زیادہ جگہ مل جاتی ہے۔ اس لئے پیٹ بہت بڑا ہو جاتا ہے۔

مسز ڈی سلوا لمبا سا چغہ پہنے جب گھر میں چلتی پھرتی تھی تو اس کا پیٹ بہت بڑا معلوم ہوتا تھا۔ قد اس کا چھوٹا تھا۔ پنڈلیاں جو بہت پتلیاں تھیں اور چغے کے نیچے آہستہ آہستہ حرکت کرتی تھیں۔ بہت ہی بھدی تصویر پیش کرتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھڑے پر مٹکا رکھا ہے۔ سارا دن اس لمبے چغے میں وہ کارٹون بنی رہتی تھی۔

شروع شروع میں بیچاری کی بہت بری حالت ہوتی تھی۔ ہر وقت قے اور متلی۔ قلفی والے کی آواز سنتی تو تڑپ جاتی ماس کو بلاتی لیکن جب کھانے لگتی تو فوراً ہی جی مالش کرنے لگتا۔ سارا دن لیموں چوستی رہتی۔

ایک دن دوپہر کے وقت میں اس کے یہاں گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ بستر پر لیٹی ہے۔ لیکن ٹانگیں اوپر اٹھا رکھی ہیں۔ میں نے مسکرا کر کہا "مسز ڈی سلوا ایکسرسائز کر رہی ہو کیا؟"

جھنجھلا کر بولی۔ "ہم بہت تنگ آگیا ہے۔ یوں ٹانگیں اوپر کر کے لیٹنے سے تو ہمارا طبیعت کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

ٹھنڈی ٹھنڈی دیوار کے ساتھ پیر لگانے سے اسے کچھ تسکین ہوتی تھی۔

بعض اوقات اس کی طبیعت گھبراتی تھی تو زور زور سے میز کو یا بستر کو جہاں بھی وہ بیٹھی ہو، مکیاں مارنا شروع کر دیتی تھی اور جب اس طرح گھبراہٹ کم نہیں ہوتی تھی تو تنگ آ کر رونا شروع کر دیتی تھی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت ہنسی آتی تھی، چنانچہ وہ تمام تکلیفیں جو مجھ پر بیت چکی تھیں بھول کر اس سے کہا کرتی تھی "مسز ڈی سلوا جان بوجھ کر تم نے یہ مصیبت کیوں مول لی"۔

اس پر وہ بگڑ کر کہتی "ہم نے کب لیا۔ پانچ برس کے پیچھے سالا یہ ہونے کو ہی مانگتا تھا"

میں کہتی "تو مسز ڈی سلوا پانچویں سال تم بنگلور کیوں نہ چلی گئیں"۔

وہ جواب دیتی "ہم چلا جاتا سچ ہم جانے کو ایک دم تیار تھا پر یہ وار اسٹارٹ ہو گیا۔ ہم وہاں رہتا۔ ہمارا صاحب یہاں رہتا ... خرچ بہت ہوتا۔ سو وہ یہ سوچ کر ہم رہ گیا اور سالا یہ آفت سر پر آن پڑا۔"

شروع شروع میں مسز ڈی سلوا کو یہ آفت معلوم ہوتی تھی پر اب وہ خوش تھی کہ دوسرا بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ قے اور متلی ختم ہو گئی تھی ٹانگیں اوپر کر کے لیٹنے کی اب ضرورت نہیں تھی، کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک رہتی تھی۔ یہ سلسلہ صرف پہلے دو مہینے تک رہا تھا۔

اب اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ایک صرف کبھی کبھی پیٹ میں اینٹھن

سی پیدا ہو جاتی تھی یا یہ بچہ جب پیٹ میں پھڑ تا تھا تو اسے تھوڑے سے عرصے کے لئے بے چینی سی محسوس ہوتی تھی۔

مسز ڈی سلوا بالکل تیار تھی۔ چھوٹے چھوٹے فراک سی کر اس نے ایک چھوٹے سے منے بیگ میں رکھ چھوڑے تھے۔ نہالچے، پوتڑے بھی تیار تھے اس کا خاوند لوہے کا ایک جھولا بھی لے آیا تھا اس کے لئے مسز ڈی سلوا نے پھٹے تکیوں کے رنڈوں سے ایک گدا بھی بنا لیا تھا۔ غرض کہ سب سامان تیار تھا۔ اب مسز ڈی سلوا کو صرف کسی ہسپتال میں جا کر بچہ جن دینا تھا اور بس۔

مسٹر ڈی سلوا نے دو مہینے پہلے ہسپتال میں اپنی بیوی کے لئے جگہ بک کرا رکھی تھی۔ پانچ روپے ایڈوانس دے دیئے تھے تاکہ عین وقت پر گڑبڑ نہ ہو اور ہسپتال میں جگہ مل جائے۔ مسٹر ڈی سلوا بہت دور اندیش تھا۔ پہلے بچے کی پیدائش پر بھی اس کے انتظامات ایسے ہی مکمل تھے۔

مسز ڈی سلوا اپنے خاوند سے بھی کہیں زیادہ دور اندیش تھی۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں اس نے ان مہینوں کے اندر اندر وہ تمام سامان تیار کر لیا تھا جو پہلے دو برسوں کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ بچے بچھانے کے لئے ربڑ کے کپڑے، فیڈر، جھنیاں۔ جھنجھنے اور دوسرے جاپانی کھلونے، اسی قسم کی اور چیزیں سب بڑی احتیاط سے اس نے ایک علیحدہ ٹرنک میں بند کر رکھی تھیں، پھر دوسرے تیسرے دن وہ یہ ٹرنک کھول بیٹھ جاتی تھی اور ان

چیزوں کو اور زیادہ قریب سے رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ دراصل وہ دن گنتی تھی کہ جلدی بچہ پیدا ہو اور وہ اسے گود میں لے کر کھلائے دودھ پلائے لوریاں دے۔ اور جھولے میں لٹکا کر سلائے۔ پانچ برس کی تعطیل کے بعد اب گویا اس کا اسکول کھلنے والا تھا۔ وہ اتنی خوش تھی جتنا کہ طالب علم ایسے موقعوں پہ ہوا کرتے ہیں۔

ہماری بلڈنگ کے سامنے ایک پارسی ڈاکٹر کا مطب تھا۔ اس ڈاکٹر کے پاس مسز ڈی سلوا ہر دوسرے روز نوکر کے ہاتھ اپنا قارورہ بھیجتی تھی کہتے ہیں۔ آخری دنوں میں قارورہ دیکھ کر ڈاکٹر بتا سکتے ہیں کہ بچہ کب پیدا ہوگا۔ مسز ڈی سلوا کا خیال تھا کہ دن پورے ہو گئے ہیں مگر یہ ڈاکٹر کہتا تھا کہ نہیں ابھی کچھ دن باقی ہیں

ایک روز میں غسل خانے میں نہا رہی تھی کہ میں نے مسز ڈی سلوا کی گھبرائی ہوئی آواز سنی۔ پھر دروازہ اور مسز ڈی سلوا کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو مسز ڈی سلوا اپنے خاوند کا سہارا لے کر اتر رہی تھی۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ میری طرف دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ میں نے بڑی بوڑھی عورتوں کا انداز اختیار کر کے کہا "ساتھ خیر کے جاؤ اور ساتھ خیر کے واپس آؤ۔"

مسز ڈی سلوا نے جب میری آواز سنی تو مسکرا کر اپنے بھورے رنگ کا ہیٹ اتار کر مجھے سلام کیا۔ میں نے اس سے کہا "مسز ڈی سلوا جونہی بے بی

ہو مجھے ضرور خبر دیجیئے گا۔

وہ مسکراہٹ جو مسٹر ڈی سلوا کے میلے ہونٹوں پہ سلام کرتے وقت پہلے آ ہو چکی تھی۔ یہ سن کر اس پہ پھیل گئی۔

سارا دن میرا دھیان مسٹر ڈی سلوا ہی میں پڑا رہا۔ کئی بار دروازہ کھول کر دیکھا مگر ہسپتال سے نہ تو کوئی ہی واپس آیا تھا۔ نہ مسٹر ڈی سلوا کا خاوند۔ شام ہو گئی۔ خدا جانے یہ لوگ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ مجھے کچھ دنوں کے لئے ماہم جانا تھا جہاں میری بہن رہتی تھی مجھے لینے کے لئے آدمی بھی آ گیا مگر ہسپتال سے کوئی خبر نہ آئی۔

تیسرے روز جب میں ماہم سے واپس آئی تو اپنے گھر جانے کے بجائے میں نے مسٹر ڈی سلوا کے دروازے پہ دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ مسٹر ڈی سلوا میرے سامنے کھڑی ہے ۔۔ ٹُنکا سا پیٹ لئے۔ میں نے حیرت سے پوچھا "یہ کیا"

وہ مجھے اندر لے گئی۔ اور کہنے لگی "ہم کو درد ہوا تو ہم سمجھا ٹائم پورا ہو گیا۔ وہاں ہسپتال میں گیا اور جب نرس لوگ نے بیڈ پر لٹایا تو درد ایک دم غائب ہو گیا۔ ہم بڑا حیران ہوا۔ نرس لوگ تو بڑا ہنسا بولا۔ اتنا جلد تم یہاں کیوں آ گیا۔ ابھی کچھ دن گھر پر اور ٹھہر و پیچھے آؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم کو بہت شرم آیا۔"

اس کا یہ بیان سن کر میں بہت ہنسی وہ بھی ہنسی۔ دیر تک ہم دونوں ہنستے

ہے۔ اس کے بعد اس نے مجھے سارا واقعہ تفصیل سے سنایا کہ کس طرح ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ ہسپتال گئی۔ وہاں ایک کمرے میں اس کے تمام کپڑے اتارے گئے نام وغیرہ درج کیا گیا اور ایک بستر پہ لٹا کر اسے نرسیں دوسرے کمرے میں گئیں۔ جہاں سے کئی دفعہ اسے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ اس بستر پہ چار پانچ گھنٹے پڑی رہی۔ اس دوران میں پہلے ایک نرس آئی اس نے اسے نہانے کو کہا۔ نہانے سے فارغ ہوئی تو ایک نرس آئی۔ اس نے اسے اینما دیا۔ اینما دینے کے بعد تیسری نرس آئی جو اس کے انجکشن لگا گئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر آئی۔ اس نے پیٹ دیکھا تو جھنجلا کر کہا "تم کیوں اتنی جلدی یہاں آگئی ہے ابھی گھر جا کر آرام کرو" سب نرسیں ہنسنے لگیں۔ وہ پانی پانی ہو گئی۔ کپڑے پہن کر باہر نکل آئی۔ جہاں اس کا خاوند کھڑا تھا۔

دونوں کو چونکہ ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور مسٹر ڈھی سلوا نے اس دن کی چھٹی لے رکھی تھی۔ اس لئے وہ ریگل سینما میں میٹنی شو دیکھنے کے لئے چلے گئے۔

مسز ڈھی سلوا کو سخت حیرت تھی کہ یہ ہوا کیا۔ پچھلی دفعہ جب اس کے بچہ ہونے والا تھا تو وہ عین موقع پر ہسپتال پہنچی تھی۔ اب اس کا اندازہ غلط کیوں نکلا۔ درد ضرور ہوا تھا اور یہ بالکل ویسا ہی تھا جو اسے پہلے بچے کی پیدائش سے تھوڑی دیر پہلے ہوا تھا پھر یہ گڑبڑ کیوں ہو گئی۔؟

پچھلے روز شام کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب میں بالکنی میں بیٹھی تھی کہ مسز ڈی سلوا کا نوکر آیا۔ دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کہنے لگا میم صاحب نے چھٹا مانگا ہے وہ ہسپتال جا رہی ہیں۔ میں نے جھٹ پٹ دس روپے کی ریزگاری نکالی اور بھاگی بھاگی وہاں گئی۔ میاں بیوی دونوں تیار تھے۔ مسز ڈی سلوا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ درد کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ میں نے اور اس کے خاوند نے سہارا دے اسے نیچے اتارا اور ٹیکسی میں بٹھا دیا۔ "ساتھ خیر کے جاؤ اور ساتھ خیر کے واپس آؤ" کہہ کر میں اوپر گئی اور انتظار کرنے لگی۔

رات کے بارہ بجے تک میں سیڑھیوں کی طرف کان لگائے بیٹھی رہی مگر ہسپتال سے کوئی واپس نہ آیا۔ تھک ہار کر سو گئی۔ صبح اٹھی تو دھوبی آگیا تو اس سے پندرہ دھلائیوں کا حساب کرنے میں کچھ ایسی مشغول ہوئی کہ مسز ڈی سلوا کا دھیان ہی نہ رہا۔

دھوبی میلے کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کر باہر نکلا۔ میں دروازے کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے باہر نکل کر مسز ڈی سلوا کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ مسز ڈی سلوا کھڑی ہے۔ مٹکا سا پیٹ لئے۔

میں نے قریب پہنچ کر پوچھا۔ مسز ڈی سلوا۔۔۔ پھر واپس

آگئیں۔" میں جب اس کے پاس گئی تو وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ شرم سے اس کا چہرہ گہرے سانولے رنگ کے باوجود سرخ ہو رہا تھا۔ رُک رُک کر اس نے مجھ سے کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ درد بالکل پہلے کے موافق ہوتا ہے۔ پر وہاں نرس لوگ کہتا ہے کہ جاؤ گھر جاؤ ابھی دیر ہے .... یہ کیا ہو رہا ہے؟"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بیچاری کی حالت قابل رحم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مرتبہ نرسوں نے اسے بہت بری طرح جھڑکا تھا۔ حیرت، شرم اور بوکھلاہٹ نے مل جل کر اس کو اس قدر قابل رحم بنا دیا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ تھوڑے عرصہ کے لئے انتہائی ہمدردی ہو گئی۔ میں دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ اس کو سمجھایا کہ اس میں شرم کی بات ہی کیا ہے۔ جب بچہ ہونے والا ہو تو ایسی غلط فہمیاں ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ نرسوں کا کام ہے بچے جنانا۔ ان کے پاس آدمی اس لئے جاتا ہے کہ آسانی سے یہ مرحلہ طے ہو جائے۔ انہیں مذاق اڑانے کو کوئی حق حاصل نہیں اور جب فیس وغیرہ دی جائے گی اور ایڈوانس دے دیا گیا ہے تو پھر وہ بے کار باتیں کیوں بناتی ہیں۔

مسز ڈیسی سلوا کی پریشانی کم نہ ہوئی۔ بات یہ تھی کہ اس کا خاوند دفتر سے دو دفعہ چھٹی لے چکا تھا۔ بڑے صاحب سے لے کر چپراسی تک سب کو معلوم

تھا کہ بچہ ہونے والا ہے۔ اب وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسی طرح محلے میں سب کو معلوم تھا کہ مسز ڈی سلوا دوبارہ ہسپتال جاکر واپس آچکی ہے کئی عورتیں اس کے پاس آچکی تھیں اور ان سب کو فرداً فرداً اسے بتانا پڑا تھا کہ بچہ ابھی تک پیدا کیوں نہیں ہوا۔ ہر ایک سے اس نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ ایک نیک کرسچین عورت تھی جھوٹ بولنے پر اسے سخت روحانی تکلیف ہوتی تھی۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی۔

ساتویں روز جب میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد پلنگ پر لیٹ کر قریب قریب سو چکی تھی۔ دفعتاً میرے کانوں میں بچے کے رونے کی آواز آئی یہ کیا؟ .... دوڑ کر میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے فلیٹ سے مسز ڈیسلوا کا نوکر گھبرایا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ اس کا رنگ فق تھا۔ کہنے لگا۔ میم صاحب بے بی۔۔۔ میم صاحب بے بی۔۔۔ میں نے اندر جاکر دیکھا تو مسز ڈیسلوا نیم مدہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ بے چاری نے اب مزید ندامت کے خوف سے وہیں بچہ جن دیا تھا۔

تین تحفے

راگ اور محبت دل پر ایک جیسا اثر کرتے ہیں۔ دونوں کے سُر ایک جیسے نرم و نازک اور تیز تند ہیں۔ دونوں میں تلخی و شیرینی پہلو بہ پہلو کروٹیں لیتی ہے۔ دونوں روح کے ساتھ کھیلتے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ موسیقی محبت سے زیادہ طاقتور ہے ـــــ وادیٔ نیل میں پہلی بار قدم رکھنے والی رقاصہ بنیا راگ اور محبت کے ہر سُر کی خفیف سے خفیف لرزش سے واقف تھی اور وہ محسوس کرتی تھی کہ مصر کے سب سے بڑے معبد کی مشہور مغنیہ بلبنگو بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

سات برس تک، وہ وادیٔ نیل کی رنگین فضاؤں میں اپنی زندگی کا کوئی نیا سپنا دیکھے بغیر سانس لیتی رہی ـــ سات برس تک وہ اپنی زندگی کا ایک ہی ورق پڑھتی رہی۔ اور اسے نیا باب کھولنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی

مگر جونہی اس کے شباب نے بیسویں منزل میں قدم رکھا۔ امنگیں دوڑ کر اس کے سینے میں داخل ہو گئیں۔ اور اس کی کتاب زندگی کے نئے اوراق چلنے لگے۔ اس کا شباب جو کہ پہلے گونگا تھا بولنے لگا۔ اور اس کے کان دنیا کی دوسری آوازوں پر بند ہو کر اس کی جوانی کی باتیں سننے میں مشغول ہو گئے۔

ایک صبح جبکہ سورج کی کنواری کرنیں دریائے نیل میں نہا رہی تھیں۔ بنیلا جوانی کی بھاری نیند سے بیدار ہوئی۔ اس کے سنبھالے نہ سنبھلنے والے شباب نے اسے تھکا دیا تھا۔ اس کی بڑی خادمہ پاس ہی قالین پر بیٹھی اس کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے یہ گیت گا رہی تھی۔

گیت

سحر کی طرح خنک اور جاں فزا ہو تم
کہ ایک مجسمۂ نکہت و ضیا ہو تم
گھنی بھویں ہیں تمہاری دراز پلکیں ہیں
کسی حسین مصور کی التجا ہو تم
تمہاری آنکھوں سے یوں جھانکتی ہے موسیقی
کہ جیسے جسم سے بربط میں ایک نوا ہو تم

(وہ یہ گاتی ہے کہ بنیلا مضطرب ہو کر اس سے کہتی ہے)

بنیلا:۔ جالا ـــ جالا ـــ طربین اتار دے ـــ سازوں کے تار توڑ

ڈال: اپنے گلے میں سُر کو ہمیشہ کے لئے دبا دے اور آ کر میرے ساتھ رو۔ اس دن کا ماتم کر جب بنیلا پیدا ہوئی تھی

جالا: آج پھر جذبات میں وہی طوفان آیا ۔۔۔ میں جانتی تھی کل کی خاموشی ضرور رنگ لائے۔

بنیلا: میں تجھ سے کیا کہوں جالا ۔۔۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ اور جوانی یونہی بیتی چلی جا رہی ہے ۔۔۔ رنگینیوں کے بغیر ۔۔۔ دل سے کوئی ہوک نہیں اٹھتی۔ جگر میں کوئی ٹیس نہیں ہوتی ۔۔۔ ہونٹ نہیں مسکراتے آنکھیں نہیں روتیں۔

جالا: پھول پیدا ہوتا ہے خوشبو دینے کے لئے جنگل میں رہے یا باغ میں شاخ پر رہے یا کسی کے بستر پر خوشبو دیتا ہی رہے گا تو پھول ہے۔

بنیلا: جو حسن کی ٹہنی پر کھلا ہے یہ خواہش نہ کر کہ تجھے کوئی توڑ کر مسل دے

بنیلا: جو مستی شراب بھرے پیالے کے ٹوٹنے میں ہے۔ بند صراحی میں نہیں ہے ۔۔۔ انگوروں کو مسل کر شراب بنائی جاتی ہے اور پھول جب مسلے جاتے ہیں تو ان عطر بنتا ہے۔

جالا: (ستار کے تار چھیڑ کر) کل جو آیا تھا ۔۔۔ وہ پھول لے کر۔

بنیلا: سب کے سب مرجھا گئے ۔۔۔ کون لے کر آیا تھا ۔۔۔ کب آیا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں رہا ۔۔۔ مجھے نیند آ رہی تھی ۔۔۔ کیا پھر آئے گا ۔۔۔ نہیں مجھے

کچھ نہ بتاؤ — میں کچھ سننا نہیں چاہتی — لاؤ مجھے میری چوڑیاں دو۔

(جالا چوڑیاں دیتی ہے)

بنیلا: جالا چوڑیاں کھنکھناتی ہیں پر میری زندگی کس قدر خاموش ہے۔ میری کتنی خواہش ہے کہ میری کشتی موجوں میں گھر کر تھپیڑ کھائے۔

جالا: یہ روز نیا تھپیڑا ہے؟

بنیلا: یہیں جالا تو نہیں سمجھتی — دنیا میں ہر جگہ دیوتا آسمان سے اتر کر عورتوں سے محبت کرتے رہے ہیں — میں کن آنکھوں سے ان کی راہ دیکھوں کن جنگلوں میں انہیں تلاش کروں، کونسی دعائیں مانگوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔ وہ یا تو مجھے جو کچھ سکھائیں یا سب کچھ بھلا دیں۔ اگر یہ دیوتا اپنے شہ نشینوں میں اوندھے پڑے رہے تو جالا کیا میں ایسا رفیق دیکھے بغیر مر جاؤں گی جو میری زندگی میں ہولناک حادثے برپا کر سکے۔

جالا: تیرے سپنے بڑے انوکھے ہیں۔

بنیلا: اور سب سے انوکھی بات یہ ہے کہ اگر کسی نے مجھ سے محبت کی تو میری سب سے بڑی خواہش یہ ہوگی کہ میری محبت کے نیچے پس جائے وہ لوگ جو اب میرے پاس آتے ہیں اس قابل نہیں کہ میری آنکھیں ان کے لئے ایک ننھا سا آنسو بھی اگلیں — میری جوانی ایک ایسے ساتھی کی تلاش میں ہے جو ساتھی سے کچھ زیادہ ہو — جو میری زندگی

میں ہلچل مچا دے۔

جالا:۔ تیری خواہش ضرور پوری ہو گی پر مجھے ڈر ہے کہ کوئی بہت بڑا حادثہ برپا ہو گا۔۔ سمندر کی زبان جب خاموش ہو تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بہت بڑا طوفان کا پیغام دے رہی ہے۔

بنیلا:۔ وہ طوفان کب آئے گا۔ جالا؟

جالا:۔ جب دو الگ الگ رستوں پہ چلنے والے ستارے آپس ٹکرا جائیں گے۔

مخالف سمت چلنے والا ستارہ دیتا صنم تراش تھا۔۔ مصر کی ملکہ اس خوبصورت نوجوان کی محبت میں گرفتار تھی اس لحاظ سے وہ وادیٔ نیل کا مالک تھا۔ مصر کے سب سے بڑے معبد کے لئے حسن و عشق کی مورتی اسی چابک دست بت ساز نے تیار کی تھی۔۔ اس کا حسن اور اس کی صنعت دونوں پوجے جاتے تھے اس کی بنائی ہوئی مورتی پر مصر کی حسین ترین عورتیں رنگا رنگ کے پھول قسم قسم کے پھل اور سمرنا کی کبوتریاں چڑھا چڑھاتی تھیں جن کے پر نازداد کے مانند اجلے اور بیر بوٹیوں کے مانند سرخ ہوتے تھے وادیٔ نیل کی ہر دوشیزہ اپنی کتاب محبت دیتا کے اس بت کے سامنے کھولنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ یوں کہئے کہ مصر کا یہ حسین بت تراش وہاں کی عورت کے دل میں دھڑکن بن کر سمایا ہوا تھا۔

جس راستے سے اس کا گذر ہوتا تھا اس پر کئی پرستار عورتیں اپنا نام لکھ دیتی تھیں اور وہ ان کو پڑھے بغیر گذر جاتا تھا اس کی ڈھیلی قبا ان ناموں کو اکثر مٹا دیا کرتی تھی۔ اگر کسی روز وہ مسلے ہوئے پھول کی پتیاں بکھیرتا آگے بڑھ جاتا تو عورتیں ان پہ ٹوٹ پڑتی تھیں اور تبرک کے طور پر اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیتی تھیں۔

اس پاس دولت تھی حسن تھا۔ جوانی تھی۔ ملکہ مصر اس کی ایک ادنیٰ کنیز تھی۔ مگر وہ ناخوش تھا۔ وہ خود کو ایک ایسی کھیتی سمجھتا تھا۔ جو مسلسل بارش کے باعث دلدل بن جائے۔ وہ محبت کئے جانے سے گھبرا کر خود محبت کرنا چاہتا تھا۔ اور آج ان ہی خیالات میں غرق دریائے نیل کے کنارے ڈوبتے ہوئے سورج میں اپنی موجودہ زندگی کا عکس دیکھ رہا تھا کہ نبیلا زیورات سے لدی پھندی اپنی چال سے آپ ہی مست ہوتی اس کے پاس گذری۔

دیبتا نے منہ پھیر لیا۔ نبیلا کے گہنوں سے اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کوئی طوائف ہے اس لئے اس کے سلام سے بچنے کے لئے اپنا منہ موڑ لیا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مصر کی حسین عورتوں کے بے نقاب چہرے دیکھ دیکھ کر وہ اکتا چکا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کے دل میں اکساہٹ پیدا ہوئی اور اس نے کنکھیوں سے نبیلا کی طرف دیکھا۔ جو چہرے

پرندو رنگ کی نقاب ڈالے دریائے نیل کے زرنگار پانی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ اس نے مصر کے سب سے بڑے بت ساز کی موجودگی کی پرواتک نہ کی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف ہوا میں تازگی اور ٹھنڈک ڈھونڈ رہی ہے اور شام کی فضا کے ارتعاش سے اپنا دل بہلانا چاہتی ہے۔

دینتا کے سینے میں ہیجان پیدا ہو گیا ـــ یہ عورت اس وقت نیل کے کنارے کیا کرنے آئی تھی ـــ کسے ڈھونڈ رہی تھی ـــ اس کو دیکھ کر اس کے قدم رک کیوں نہ گئے ـــ اس نے یقیناً اسے دیکھا تھا جب وہ اس کے پاس سے گذری تھی تو اسے ملکۂ مصر کے محبوب کی موجودگی کا علم تھا۔ مگر وہ آداب بجالائے بغیر بے پروا ہوا کے مانند پاس سے گذر گئی ـــ کیوں ـــ کیوں ـــ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیلا بولی ـــ اسی دلکش انداز سے ـــ دینتا سے نہ رہا گیا۔ وہ آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا۔

دینتا:- اے تیز رو حسینہ میرا سلام قبول کر۔

نیلا:- کر لیا۔

دینتا:- یہ تیز قدم تجھے کدھر لئے جا رہے ہیں۔

نیلا:- واپس!

دینتا:- بالکل اکیلی۔

نیلا:- بالکل اکیلی۔

دیپتا:۔ اپنے شوہر کے پاس۔

(بنیلا قہقہہ لگا کر ہنستی ہے)

دیپتا:۔ سورج دریا تے نیل میں غوطہ لگا گیا ہے۔ اب اندھیرے میں کسے ڈھونڈ رہی ہے۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔

بنیلا:۔ مجھے کسی کی تلاش نہیں۔ میں اکیلی سیر کے لئے نکلی ہوں۔

دیپتا:۔ لیکن یہ زیور تو نے صرف اپنا دل خوش کرنے کے لئے نہیں پہنے ـــ اور یہ پہلا نقاب۔

بنیلا:۔ میں نے یہ زیور اپنی خوشی کے لئے پہنے ہیں۔ اس لئے کہ یہ بتاتے ہیں میں خوبصورت ہوں۔ اور چلتے ہوئے میں اپنی ناک ـــ انگلیوں کی طرف دیکھتی ہوں: جوان انگوٹھیوں کی شان دوبالا کرتی ہیں۔

دیپتا:۔ تیرے ان ہاتھوں میں ایک آئینہ ہونا چاہئے جس میں تو صرف اپنی آنکھیں دیکھتی رہے ـــ یہ آنکھیں ـــ اُف یہ آنکھیں

بنیلا:۔ ان آنکھوں میں نیند آ گئی ہے ـــ میں تھک کر چور ہو گئی ہوں۔ مجھے اب جانا چاہئے۔

دیپتا:۔ کس راستے سے کدھر؟

بنیلا:۔ میں ہرگز نہیں بتاؤں گی ـــ واہ تو نے مجھ سے یہ پوچھا تک نہیں کہ اس میں میری خوشی ہے کہ نہیں ـــ کس راستے سے؟

کدھر ——— کیا بے تکلفی سے تو نے یہ کہہ دیا ——— کیا تو سمجھتا ہے۔
کہ میں ایک بازاری عورت ہوں ——— تجھے معلوم ہے کہ مصر
میں کن کن دروازوں پہ میرا استقبال ہوتا ہے ——— تو نے
کیا وہ تمام آدمی شمار کئے ہیں جو بنیلا کے التفات کو سرمایۂ حیات
سمجھتے ہیں ——— کس راستے سے کدھر ——— میں تجھے ہرگز نہیں
بتاؤں گی۔ یہیں کھڑا رہ یا چلا جا۔ میری ہم رکابی کا شرف تجھے
ہرگز نصیب نہ ہوگا۔

دیوتا۔ تو شاید نہیں جانتی کہ میں کون ہوں ؟

بنیلا۔ میں تجھے اچھی طرح جانتی ہوں ——— تو دیوتا سنگ تراش
ہے۔ تیرے ہاتھوں نے اس دیوی کی مورتی تیار کی ہے۔ جس کو
میں پوجتی ہوں۔ تو ملکہ مصر کا عاشق ہے اور اس شہر کا مالک
پر میری نظروں میں تو ایک حسین غلام ہے اس لئے کہ آج
تو نے مجھے دیکھ لیا ہے اور میری محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔
میری طرف یوں گھور گھور کے نہ دیکھ۔ کچھ کہنے کی کوشش نہ کر
میں جانتی ہوں تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ تو نے آج تک کسی سے
محبت نہیں کی بلکہ تجھ سے محبت کی جاتی رہی ہے ——— پر اب
تو میری محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اس وقت سر جھکائے

تو میری گھنی پلکوں کی خوبصورتی پر غور کر رہا ہے۔ اور یہ سوچتا ہے کہ میرے ہونٹ کتنے نازک ہیں۔ میرے بال کس قدر ملائم ہیں جن بالوں پر تو آج غور کرتا ہے ان پر لاکھوں آدمی ایک زمانے سے غور کر رہے ہیں۔ میرے حسن کے چرچے مصر کے ذرّے ذرّے کی زبان پر ہیں:: پچھلے برس میں نے بیس ہزار آدمیوں کے سامنے رقص کیا اور معلوم ہے کہ تو ان خوش قسمت آدمیوں میں موجود نہیں تھا ـــــ کیا تو سمجھتا ہے کہ میں اپنے کو چھپاتی ہوں نہیں ـــــ سب میرے چند حیا دینے والے حسن کی بار دیکھ چکے ہیں ـــــ لیکن تو ـــــ ایک طرف تو مجھے پھر کبھی نہیں دیکھے گا۔ جو کچھ کہ میں ہوں جو کچھ کہ محسوس کرتی ہوں۔ میری محبت میرے حسن کی بابت تو کچھ بھی نہیں جان سکے گا ـــــ تو ایک حقیر ہے پست بچھورا، ظالم بے حس اور بزدل انسان ہے ـــــ مجھے حیرت ہے کہ ابھی تک کسی عورت کے دل میں اتنی نفرت کیوں پیدا نہیں ہوئی کہ وہ تجھے اور ملکۂ مصر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دے۔

(دیبتا اور نیلا چند لمحات کے لئے خاموش کھڑے رہتے ہیں)

دینا:۔ دیبتا کے ساتھ چلنے سے انکار کر کے جو تو نے شان پیدا کی ہے۔

بالآخر تیرے لئے بہت مہنگی ثابت ہوگی ۔۔۔ میں پوچھتا ہوں۔
تجھے ڈر کس بات کا ہے۔

بنیلا:۔ تو جو کہ دوسروں کی محبت کا عادی ہے کیا بتا سکتا ہے کہ اس عورت کو کیا دینا چاہئے۔ جو محبت نہیں کرتی۔

دیتا:۔ میں تیرے قدموں پر مصر کا سارا سونا ڈھیر کر دوں گا۔

بنیلا:۔ اس سے زیادہ سونا میرے بالوں میں ۔۔۔ مجھے سونا نہیں چاہئے مجھے صرف تین چیزوں کی خواہش ہے کیا دے سکتا ہے۔

دیتا:۔ بول وہ تین چیزیں کیا ہیں؟

بنیلا:۔ مجھے چاندی کا ایک آئینہ چاہیئے کہ اس میں ہر روز اپنی آنکھوں کا خمار دیکھا کروں۔

دیتا:۔ تجھے مل جائے بول جلدی بول باقی دو چیزیں کیا ہیں۔

بنیلا:۔ مجھے ہاتھی دانت کی ایک کنگھی چاہئے۔ جو میرے بالوں میں اس طرح غوطے لگائے۔ جیسے کرنوں بھرے پانی میں ماہی گیروں کے جال۔

دیتا:۔ تیسری چیز؟

بنیلا:۔ موتیوں کی ایک مالا جسے پہن کر میں تیرے لئے سہاگ کا ناچ ناچوں گی۔

دیمتا:۔ بس۔

بنیلا:۔ مجھے یہ مالا مل جائے گی نا؟

دیمتا:۔ جیسے تو چاہے گی۔

بنیلا:۔ جیسی میں چاہوں۔ میں بھی یہی کہنا چاہتی تھی۔ بول اب میں کیا اپنے تحفے انتخاب کروں۔

دیمتا:۔ کیوں نہیں۔

بنیلا:۔ کیا تو قسم کھاتا ہے کہ مجھے یہ چیز لا دے گا۔

دیمتا:۔ میں قسم کھاتا ہوں۔

بنیلا:۔ کس کی۔

دیمتا:۔ جس کی تو کہے۔

بنیلا:۔ حسن و عشق کی اس دیوی کی قسم کھا جس کی مورتی تو نے تیار کی ہے

دیمتا:۔ میں اسی کی کھاتا ہوں۔

بنیلا:۔ تو میں نے اپنے تحفے چن لئے۔

دیمتا:۔ اتنی جلدی۔

بنیلا:۔ واقعی میں نے اپنے تحفے بہت جلدی چنے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں چاندی کا کوئی ایسا آئینہ قبول کر لوں گی جو مصر کے بنجارے بازاروں بیچتے پھرتے ہیں۔ مجھے وہ آئینہ چاہئے جس میں یونان کی

مشہور شاعرہ سیپفو اپنا چہرہ دیکھتی رہی ہے۔ اور جواب یہاں کی مشہور طوائف سارہ کے پاس ہے۔ وہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تو اسے چرا لائے گا۔

دیپتا:۔ یہ سراسر دیوانگی ہے ـــــ تو چاہتی ہے کہ میں چوری کروں۔

بنیلا:۔ میں یہ سمجھتی تھی کہ مرد اپنے قول پر رہا کرتے ہیں۔

دیپتا:۔ میں اپنے قول پر قائم ہوں۔

بنیلا:۔ اور یہ جو ہاتھی دانت کی کنگھی میں تجھ سے مانگ رہی ہوں معمولی کنگھی نہیں ـــــ یہ وہ کنگھی ہے جو یہاں کے سب سے بڑے کاہن کی بیوی اپنے بالوں میں لگائے رکھتی ہے یہ کنگھی اس ملکہ کے پاس تھی جو آج سے پانچ سو برس پہلے وادیٔ نیل پر ـــــ حکمران تھی۔

دیپتا:۔ پر میں یہ حاصل کیسے کروں گا؟

بنیلا:۔ اس کو قتل کر کے ـــــ یہ کنگھی مجھے کل دوسرے تحفوں سمیت مل جانی چاہیئے۔

دیپتا:۔ پہلے چوری پھر قتل ـــــ چلو ایسا ہی سہی۔

بنیلا:۔ تیسرا تحفہ موتیوں کی وہ مالا ہے جو تیرے ہاتھ کی بنائی مورتی کے گلے میں پڑی رہتی ہے۔

دیپتا:۔ تو حد سے بڑھ گئی ہے بنیلا۔ سن لے، تجھے کچھ نہیں ملے گا۔ نہ آئینہ، نہ کنگھی اور نہ موتیوں کی مالا ــــ تو میرے جذبات کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں کھیل سکتی۔

بنیلا:۔ تیری جو زبان جو کچھ کہتی ہے۔ اس کو تیرا دل نہیں مانتا۔ اپنے آپ کو دھوکا نہ دے ــــ یہ تینوں تحفے تو کل مجھے یقیناً لا دے گا۔ پھر تو میرے پاس آیا کرے گا ــــ ہر شام کو ــــ اور میں مقررہ وقت پر سولہ سنگھار کیے تیری راہ دیکھا کروں گی ــــ میرا لباس تیری مرضی کے مطابق ہوگا۔ میرے بال تیری خواہش کے مطابق گوندھے جائیں گے۔ میں تیرے پیار کے لئے تیار رہا کروں گی۔ جیسے سیپی سمندر کی گود میں بارش کے قطرے پینے کے لئے تیار رہتی ہے ــــ اگر تو نرم و نازک محبت چاہے گا تو میں تجھے بچوں کی مانند کھلاؤں گی۔ اگر تو چاہے گا کہ میں خاموش رہوں تو میں چاندنی راتوں کی طرح چپ چاپ رہوں گی اور جب تیری خوشی ہوگی کہ میں گاؤں تو تیرے کان ملک ملک کے گیت سنیں گے۔ مجھے ایسے گیت یاد ہیں جو چشموں کے آبی نغموں سے بھی دھیمے ہیں۔ اور ایسے گیت بھی یاد ہیں جو کڑکتی بجلی سے بھی زیادہ خوفناک

ہیں۔ مجھے ایسی سیدھی سادی اور تروتازہ بولیاں بھی آتی ہیں۔
جو کنواری لڑکیاں اپنی ماؤں کو سُنا سکتی ہیں اور ایسی غزلیں
بھی یاد ہیں جو صرف تنہائی میں سنی جاتی ہیں اگر تو کہے گا تو
رات رات بھر میں تیرے حضور میں ناچوں گی۔ ایسے ناچ جو
تتلیوں کو تھرکنا بھلا دیں اور عود کے دھوئیں کو پریشان
کر دیں۔ ملکہ مصر دولت مند ہے۔ مگر اس کے محل کے اندر
ایسا کوئی بھی کمرہ نہیں جو میرے حجرہ خاص کا مقابلہ کر سکے ۔
اس کے اندر سجاوٹ اور زیبائش کے ایسے سامان ہیں
جن کی تعریف کے لئے بڑے بڑے شاعر آج تک لفظ نہیں
ڈھونڈ سکے ـــــ اور تو جانتا ہے۔ سب سے بڑی
سجاوٹ کون ہے۔

بنیلا جس سے تو محبت کرتا ہے۔ پر اُسے اچھی طرح نہیں جانتا
ـــ تو نے صرف میرا حسین چہرہ دیکھا ہے لیکن تو نہیں جانتا
کہ میں ساری کی ساری حسین ہوں ـــ دیلیتا ایک نہیں ایسے
ہزاروں تعجب تجھے ہر روز ہوں گے۔ جب ہر بار میرا حسن ایک
نئی چیز کا انکشاف کرے گا۔ آہ! تو مجھ سے کس قدر والہانہ محبت
کرے گا ـــ

میری بانہوں میں فرطِ مسرت سے تو کیسے کانپ اٹھے گا ـــــ مجھے یقین نہیں آتا کہ تو نے وہ فضول سی کنگھی لانے سے انکار کر دیا ہے جب کہ میرے سنہرے بالوں کی ساری لٹیں تیرے شانوں پر بل کھایا کریں گی ـــــ نہیں ابھی نہیں ـــــ اس وقت تو انہیں ہاتھ لگانے کا حقدار نہیں ـ کل ـ کل ـــــ

دیپتا:۔ ہاں کل ـــــ کل تینوں تحفے تیرے قدموں میں ہوں گے۔

نبیلا:۔ اگر تو میرے لئے موتیوں کی وہ مالا بھی لے آیا جو عشق کی مورتی کے گلے میں پڑی ہے تو میں تجھے بتاؤں گی کہ میرے ہونٹوں میں اتنے بوسے ہیں جتنے سات سمندروں میں موتی ـــــ لو اب کل ملیں گے ـــــ

کل . . . . یعنی دوسرے دن دیپتا صنم تراش کو ایک عورت کے لئے جس کے حسن نے اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی. تین عجیب و غریب تحفے لے جانا تھے ـــــ مصر کی حسین ترین عورتوں پر مدارج کرنے والا ایک غلام بن کے رہ گیا تھا اگر نبیلا اس کے دل و دماغ پر پوری طرح نہ چھا گئی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ وہ اس عورت کی عجیب و غریب خواہشات کو دریائے نیل کی لہریں سمجھتا جو پتھریلے

ساحل کے ساتھ ٹکراتی ہیں اور جھاگ بن کر لوٹ جاتی ہیں۔ مگر وہ نبیلا کے حسن کی تیز و تند لہروں میں بہہ گیا تھا اور بہتا چلا جا رہا تھا یہ سیلاب بلا خیز اس سے کہ وہ سنبھلنے پائے اُسے مصر کے سب سے بڑے کاہن کی بیوی کی خوابگاہ تک لے گیا اور اس نے وہ کام کیا جس کا اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کنگھی حاصل کرنے کے لئے اسے کاہن کی بیوی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا پڑے۔ جب دمتیاس نے اس عورت کے سینے میں زہریلی سوئی چبھوئی تو اس کا دل اس مسرت سے دھڑکتا دھڑکتا بند ہو گیا کہ اس کا قاتل مصر کا وہ حسین نوجوان ہے جس کے دیدار کے لئے وہ اپنی سو جانیں بھی قربان کرنے کے لئے تیار تھی۔ کنگھی حاصل کرنے کے بعد یعنی اپنے عشق کی پہلی خونیں منزل طے کر کے دمتیاس نے بڑی صفائی سے مشہور رقاصہ سارہ کے مکان سے چاندی کا وہ آئینہ چرایا جس میں شعلۂ نفس شاعرہ سیفو اپنے روئے نگار دیکھا کرتی تھی۔ شبہ ایک جوان سال لڑکی پر کیا جس کے شباب کا شعلۂ اولین بھی لپکنے نہ پایا تھا۔ اس دوشیزہ کو اس جرم میں سولی پر چڑھا دیا گیا۔ نبیلا کے عشق کو دمتیاس نے خون کا یہ دوسرا گھونٹ پلایا اور موتیوں کی وہ مالا لینے کے لئے روانہ ہو گیا جو اس کی بنائی ہوئی مورتی کے گلے میں پڑی تھی۔ یہ اس نے کانپتے ہوئے حسن کی

عشق کی مورتی کے گلے سے جدا کی اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے رات کے آسمان کی پیشانی سے سے تاروں کی ساری افشاں چھین لی ہے دیوی کی اس بے حرمتی پر اسے افسوس ہوا مگر نبیلا اس سے بڑی دیوی تھی ۔۔ اب تینوں تحفے اس کے پاس تھے اور جب انہیں سامنے کر نبیلا سے ملنے گیا تو اسے یقین تھا کہ وہ اسے کسی نئے اور کڑے امتحان میں ڈال دے گی ۔۔۔ وہ اس کے لیے تیار تھا۔

بلا:۔ آیا میرے تحفے ۔۔۔ تو لے آیا میرے تحفے ۔۔ مجھے یقین تھا کہ تو خالی ہاتھ کبھی نہ ملنے آئے گا۔

بنا:۔ اس لیے کہ تیرے حکم تعمیل لازم تھی۔

بلا:۔ آہ دیوتا میرے پیارے دیوتا تو کتنا اچھا ہے ۔۔ جو کچھ اس وقت مجھے محسوس ہوتا ہے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا ۔۔۔ مقدس دیوتاؤں کی قسم مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ محبت کیا ہے ۔۔۔ پیارے اب میں تجھے اس سے کہیں زیادہ محبت دوں گی۔ جس کا میں نے تجھ سے کل وعدہ کیا تھا ۔۔۔ وہ عورت جو سمندر میں ٹھوس چٹان کی مانند کھڑی تھی آج پاش پاش ہو گئی ہے۔

بوڑھے آسمان نے شاید ہی ایسا انقلاب دیکھا ہو ۔۔۔ تو یہ سمجھتا ہو گا کہ میں تجھ سے صرف محبت کر دوں گی ۔۔ نہیں آج میں اپنے حسن کی

تمام خوبیاں تیری نذر کرتی ہوں اپنی ساری معصومیت تیری بھینٹ
چڑھاتی ہوں۔ اپنی کنواری روح کی تمام کپکپاہٹیں تیرے حوالے کر
ہوں — آ — اب یہ شہر چھوڑ کر کچھ عرصہ کے لیئے کہیں بھاگ جا۔
کسی ایسی جگہ جا رہیں جہاں تیرے میرے سوا اور کوئی نہ ہو
کوئی نہ ہو — جہاں ہم ایسے دن گذاریں جن پر سہاگ کی راتیں رشک
کریں۔ عشق و محبت کی تاریخ میں شاید ہی ایسے کارنامے کا ذکر ہو
کہ تو نے میرے لیئے سرانجام دیا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس
زمین پر مجھ ایسی والہانہ محبت کرنے والی پیدا ہوئی ہے اور نہ ہو
— پھر تیرے ہونٹوں پر یہ مہر خاموشی کیوں لگی ہے۔ تو بولتا
کیوں نہیں۔

دیمنا:۔ میں کیا بولوں — حیرت مجھے نہ جانے کہاں بہا لے گئی ہے —
میں سمجھتا تھا آسمان بہت اونچا ہے۔ پر اس وقت وہ مجھے زمین پر
لیٹا دکھائی دے رہا ہے۔

بنیلا:۔ یہ تو نے کیا کہا — یہ تو نے کیا کہا۔

دمینا:۔ میں کہتا ہوں الوداع — الوداع۔

بنیلا:۔ الوداع — یہ میں کیا سُن رہی ہوں دیمنا — یہ تین تحفے دنے
اتنی مشکلوں سے صرف اس لیئے حاصل کیئے تھے کہ مجھے اور میری

محبت کو الوداع کہہ دے۔

ہیتا: مجھے اپنا وعدہ پورا کرنا تھا سو میں نے کر دیا۔

...ا: میں سمجھتی نہیں۔

ہیتا: تو سمجھے یا نہ سمجھے مجھے اب اس سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ چھوٹا سا اسرار یہ ننھی سی گتھی اب تیرے ناخن تدبیر کے لئے چھوڑتا ہوں ——

الوداع ——

بلا: دیوتا —— دیوتا —— یہ میں کیا سن رہی ہوں —— یہ لہجہ کہاں سے پیدا ہو گیا —— کیا سچ مچ یہ لفظ تیری زبان سے نکلے ہیں —— مجھے کچھ تو بتا —— آخر ہوا کیا۔

تا: کیا میں ایک ہی بات ہزار بار دہراؤں۔ تیرے ہی لئے ہاتھی دانت کی کنگھی لانے کے لئے میں نے کاہن کی بیوی کو قتل کیا۔ تیرے ہی لئے میں نے سارہ کے یہاں سے آئینہ چرایا اور اصل مجرم کے لئے بجائے ایک معصوم دوشیزہ پھانسی پر چڑھا دی گئی۔ تیرے ہی لئے میں نے حسن و عشق کی مورتی کے گلے سے موتیوں کا ست لڑا ہار اتارا۔ یہ تین تحفے تجھے تیرے حضور میں حاضر کرنا تھے۔ جن کے عوض میں تیری طرف سے مجھے صرف ایک چیز ملتی تھی —— تیری التفات —— اس وقت میں نے یہ سودا بہت مہنگے داموں پر قبول کر لیا

لیکن اب مجھے اس جنس کی قدر و قیمت معلوم ہو گئی ہے۔ جسے خرید رہا تھا۔ اب میں تجھ سے کچھ نہیں مانگتا ــــــ تو بھی اسی طرح مجھ سے کچھ طلب نہ کر اور چپ چاپ چلی جا

مجھے حیرت ہوتی ہے۔ کہ ایسی سیدھی سادی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی۔

بلیلا:۔ اگر یہی بات ہے تو یہ تحفے اپنے پاس رکھ ــــــ کیا سمجھتا ہے مجھے ان کی ضرورت ہے ــــــ نہیں میں تو صرف تجھے چاہتی ہوں ــــــ صرف تجھے ــــــ

دمیتا:۔ مجھے معلوم ہے ــــــ مگر میں اب تجھے نہیں چاہتا اور چونکہ ایسے معاملوں میں طرفین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے اس لئے ہمارا ملاپ ناممکن ہے ــــــ میں نے کھلے الفاظ میں تجھے سمجھانے کی انتہائی کوشش کی ہے ــــــ مگر افسوس ہے کہ میں اپنے دل کی بات تجھ پر واضح نہیں کر سکا۔ دراصل مجھ میں اتنی قدرت بھی نہیں ہے کہ تجھے اچھی طرح سمجھا سکوں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تو اس حقیقت کو جیسی بھی ہے قبول کر لے ــــــ تو مجھے مجبور کرنا چاہتی ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ یہ راکھ نہیں ہو سکتی۔ ایسی حالت میں ہماری گفتگو سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا

بنیلا:۔ میری طرف سے لوگوں نے یقیناً تیرے کان بھرے ہیں۔
دمیتا:۔ تیرے شکوک بے بنیاد ہیں۔
بنیلا:۔ نہیں نہیں۔ میں سب جانتی ہوں ــــ مجھے سب کچھ معلوم ہے
لوگوں نے ضرور میرے بارے میں زہر اگلا ہے ــــ انکار نہ کر
ــــ وادیٔ نیل میں اتنے ذرّے نہیں جتنے کہ میرے دشمن ہیں
ــــ میرے خلاف یقیناً تجھ سے کہا گیا ہے۔ لیکن دمیتا تجھے ان کی
زہریلی باتیں ہرگز نہیں سننا چاہیئے تھیں۔ مقدس دیوتاؤں کی قسم جو کچھ
تجھ سے کہا گیا ہے۔ سفید جھوٹ ہے۔
دمیتا:۔ مجھ سے تیرے خلاف کسی نے کچھ نہیں کہا۔
بنیلا:۔ دمیتا تو نے یہ نہیں سوچا کہ میں تجھے دھوکا دے ہی نہیں سکتی
اس لئے کہ میں تجھ سے سوائے تیرے اور کسی چیز کی طالب نہیں
تو پہلا آدمی ہے۔ جس سے میں نے ان الفاظ میں گفتگو کی ہے۔
دمیتا:۔ ایسی باتوں کا وقت گذر چکا ہے ــــ ایک بار تو میری ہو چکی
ہے ــــ ایک دفعہ میں تجھے اپنا بنا چکا ہوں۔
بنیلا:۔ کب، کہاں، کیسے ــــ یہ تو کیسی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔
دمیتا:۔ میں سچ کہتا ہوں ــــ تجھے اپنائے بغیر میں تجھے اپنا بنا چکا ہوں۔
تجھ سے جو کچھ چاہتا تھا غیر ارادی طور پر تو نے مجھے دے دیا ہے ــــ

—— تو مجھے خوابوں کی دنیا میں لے گئی۔ میں مانتا ہوں ، پر اب اُس دنیا میں واپس جاکر اُس حُسن اور خوبصورتی کا نظارہ کرنے کی مجھ میں تاب نہیں۔ اور نہ تو مجھے اُس دنیا میں بھر لے جاسکتی ہے ——
ایک راستے پر مسرت اور شادمانی سے دو مرتبہ ملاقات نہیں ہوا کرتی —— ہم ایک سڑک پر مخالف سمتوں سے آرہے تھے —— تھوڑی سی دیر ہمارے قدم رکے۔ مگر اب ہمیں جدا ہونا چاہیئے —— تیرا راستہ ادھر ہے۔ اور میرا راستہ ادھر

بنیلا: صرف ایک ہی نظارے سے تیری نگاہیں سیر ہو گئیں ——
ایک ہی بار خوابوں کی دنیا میں جاکر تیرا جی بھر گیا —— پھولوں بھرے باغ میں جاکر تو ایک ہی کلی پر قناعت کر گیا۔

دیبتا: تو اصلیت کے قریب پہنچ گئی ہے —— میں ایک ہی نظارے خوابوں کی دنیا کی ایک ہی سیر اور پھولوں بھرے باغ کی ایک ہی کلی پر قانع رہتا ہوں —— اس لئے کہ میں اس نظارے کے حسین تخیل، اس سیر کی مسرت بخش یاد اور اس کی کلی کی پیاری مہک کو اپنے دل و دماغ میں قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے تیری تصویر کو جس سنہرے فریم میں دیکھا ہے۔ اسے بدلنے کی کوشش نہ کر۔

بنیلا:- اور میرے ــــ میرے متعلق تو کیا کہتا ہے۔ جو اتنی بھیانک باتیں سننے پر بھی تجھ سے محبت کرتی ہے۔ کیا میں نے وہ خواب دیکھا ہے جس کا ذکر تو بار بار کرتا ہے۔ اور کیا میں اس مسرت اور شادمانی کی گھڑیوں میں تیری شریک رہی جو تو نے مجھ سے چرائی ہیں ــــ ہاں چرائی ہیں ــــ!

دیلیتا:- کیا اس وقت تجھے میرا خیال تھا جب میری کمزوری سے فائدہ اٹھا کر تو نے مجھ سے تین شرمناک فعل کرائے ــــ تین شرمناک فعل جو ساری زندگی مجھے تین مہیب دیو بن کر ڈراتے رہیں گے ــــ صرف ایک لمحہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر تو نے مجھ سے تین احکام منوائے جو میری زندگی کو پاش پاش کر سکتے تھے۔

بنیلا:- میں نے یہ صرف اس لئے کیا کہ تو میرا ہو جائے ــــ سارے کا سارا میرا ــــ تیری ہو کر میں تجھے اپنا کبھی نہ بنا سکتی۔

دیلیتا:- تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔ لیکن صرف چند لمحات کے لئے ــــ تو نے مجھے اپنا غلام بنانا چاہا۔ پر اب میں تیری غلامی سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔

بنیلا:- دیلیتا تو کسی کا غلام نہیں۔ میں تیری کنیز ہوں۔

دمیتا: ہم میں سے وہی دوسرے کا غلام ہے جو کہ محبت کرتا ہے .... غلامی ...... یہ عشق کا دوسرا نام ہے ...... تم سب عورتوں کے دل و دماغ میں ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ تمہاری کمزوری مرد کی طاقت پاش پاش کردے اور تمہاری بے شعوری اس کی دکاوت پر حکومت کرے۔ تم محبت کرنا یا محبت کئے جانا پسند نہیں کرتیں —— شباب کی آمد کے ساتھ ہی یہ خواہش تمہارے سینے میں کروٹیں لینے لگتی ہے کہ تم کسی مرد کو غلام بناؤ۔ اس کو ذلیل کرو اور سر جھکا کر اس پر اپنے چپل رکھ دو۔ پھر تم ہم لوگوں سے اپنی مرضی کے مطابق تلوار، تیشہ، قلم اور ہر وہ چیز جو تم پر قادر ہے چھین سکتی ہو۔ توڑ سکتی ہو —— اس وقت تم چاہو تو ہر کیوپس پہلوان سے گرز لے کر اس کے ہاتھ میں چرخہ دے دو —— لیکن تم کسی مرد کی گردن جھکانے میں ناکام رہتی ہو۔ تم ان ہاتھوں کو اچھا سمجھتی ہو۔ جو تمہارے گورے بدن پر تیل ڈال دیں۔ اس مرد کو دیوانہ وار چاہتی ہو جس کا سخت گھٹنا تمہاری گردن دباتا رہے —— حتیٰ کہ اس مرد سے بھی التفات کرتی ہو جو ہر روز تمہاری توہین کرے۔ وہ مرد جو تمہارے پاؤں چومنے سے انکار کر دے تو تم اسے سر پر بٹھا لوگی —— وہ مرد جس کی

آنکھیں تمہاری رخصت پر نمناک نہیں ہوتیں تمہاری چٹیا پکڑ کر جہاں چاہے تمہیں لے جا سکتا ہے۔ محبت زدہ عورت چونکہ تو غلام نہیں بنا سکی اس لئے تجھے غلامی قبول کرنا ہوگی —

بنیلا:- دینیتا۔ تو مجھے مار پیٹ، میرا بدن نیلوں سے بھر دے۔ مگر اس کے بعد مجھ سے محبت ضرور کر۔

دینیتا:- نہیں اب مجھے تجھ سے نفرت ہے۔

بنیلا:- تو جھوٹ کہتا ہے۔ تیری روح کے اندر میں سما چکی ہوں۔ تو صرف ایک عورت کے سامنے جھکنے سے شرماتا ہے لیکن پیارے اگر صرف اتنی سی بات تیرے وقار کی تسکین کے لئے کافی ہے تو مجھے تیری غلامی قبول ہے۔ تجھے حاصل کرنے کے لئے میں اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہوں۔ اس سے کہیں زیادہ جو تو نے اب تک مجھے دیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بول میں تیرے لئے کیا قربانی کر سکتی ہوں۔ ایک بار تجھے اپنا بنا کر مجھے زندگی سے کوئی شکایت نہ رہے گی —

دینیتا:- کیا تو قسم کھاتی ہے۔

بنیلا:- حسن و عشق کی دیوی کی قسم میں تیرے لئے ہر قربانی کرنے کو

تیار ہوں۔

مینتا:۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لے۔

نیلا:۔ دیر نہ کر جلدی بول۔ تو مجھ سے کیسی قربانی چاہتا ہے۔

مینتا:۔ بالکل معمولی۔ میں تجھ سے تیری طرح تین تحفے نہیں مانگتا۔ اس لئے کہ یہ رواج کے خلاف ہوگا ـــــ لیکن میں تجھے تحفے قبول کرنے کے لئے ضرور کہہ سکتا ہوں ـــــ کیا نہیں ؟

نیلا:۔ کیوں نہیں !

مینتا:۔ یہ آئینہ کنگھی اور ہار منگاتے وقت کیا تجھے ان کو استعمال کرنے کا خیال تھا۔

اس چوری کے آئینے، اس خون آلود کنگھی اور اس مقدس ہار کو ـــــ یہ ایسے جواہرات نہیں ہیں کہ ان کی عام نمائش کی جائے

نیلا:۔ بہت دور کی سوجھی۔

مینتا:۔ پہلے میرا ایسا خیال نہیں تھا۔ مگر اب مجھے معلوم ہوا ہے۔ کہ تو نے محض ظلم ڈھانے کی خاطر مجھ سے تین جرم کرائے۔ تین جرم جن سے مصر میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا ہے۔

اب تجھے ان تحفوں کی عام نمائش کرنی ہوگی ـــــ آئینہ ہاتھ میں لے کر کنگھی بالوں میں سجا کر، اور ہار گلے میں پہن کر تو باغ میں بسر

کے لئے جائے گی۔ لوگ تجھے دیکھیں گے اور فوراً ہی ملکہ کے سپاہیوں کے حوالے کر دیں گے ــــ لیکن تجھے وہ چیز مل جائے گی جس کی تجھے خواہش تھی اور میں سورج طلوع ہونے سے پہلے زندان میں تیری ملاقات کے لئے آؤں گا ــــ الوداع

جس طرح دینیا اپنے وعدے پر قائم رہا اسی طرح بنیلا نے اپنا قول پورا کیا۔ چنانچہ اسی روز شام کو جب کہ سورج کی کرنیں دریائے نیل کی لہروں کو چوم رہی تھیں۔ بنیلا اٹھی اور اپنی بڑی خادمہ کو حکم دیا کہ وہ اُسے اچھی طرح سجائے، سج سجا کر اس نے اپنے سنہرے بالوں میں کنگھی جمائی، گلے میں سونے کا ہار پہنا اور ہاتھ میں آئینہ لے کر باغ خاصہ کی سیر کو چل دی۔

لوگوں نے وہ تین چیزیں دیکھیں جن کے گم ہو جانے پر سارے مصر میں ہنگامہ برپا ہو گیا تھا اور حیرت میں غرق ہو گئے بعض عورتیں اس نظارے کی تاب نہ لا سکیں اور بنیلا کے خوفناک انجام نے ان پر کپکپی طاری کر دی۔ مگر بنیلا کے قدم پہلے سے زیادہ مضبوط تھے۔ باغ کی پتھریلی روشوں پر چلتے ہوئے وہ

سنگ مرمر کا ایک حسین مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔
فوراً ہی آگ کی طرح یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ حسن و عشق کی مقدس دیوی کا ست لٹ گیا۔ ساہہ کا آئینہ جس میں سینفو اپنا چہرہ دیکھا کرتی تھی اور کاہن کی بیوی کی کنگھی بنیلا رقاصہ کے پاس ہے۔ چنانچہ بنیلا ابھی باغ کی تیسری روش ہی پہ چلی کہ ملکہ مصر کے سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا اور زندان میں قید کر دیا۔

ساری رات وہ اس اندھیرے زندان میں طرح طرح کے ڈراؤنے خواب دیکھتی رہی۔ بار بار وہ کسی وحشت ناک خیال میں کانپ اٹھتی۔

اسی ادھیڑ بن میں صبح ہو گئی۔ اور حسب وعدہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ دمینا زندان میں داخل ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے جلاد جس کے ہاتھ میں زہر کا پیالہ تھا۔ پیشتر اس کے کہ بنیلا دمینا سے کچھ کہے زہر کا پیالہ اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔

محبت کا یہ آخری جام اس نے ہونٹوں سے لگایا اور سارا زہر غٹا غٹ پی گئی۔

زہر پینے کے بعد اس نے کنکھیوں سے دمیتا کی طرف دیکھا گویا وہ اس سے یہ کہنا چاہتی ہے: "دیکھ موت کا بوسہ یوں لیا کرتے ہیں۔" مگر دمیتا نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ اس کے پاؤں دبا کر جلاد نے پوچھا "کیا تجھے کچھ محسوس ہوا ہے؟"

بنیلا نے جواب دیا "نہیں!"

پھر جلاد نے اس کے گھٹنے دبائے۔ "اب؟"

پیشتر اس کے کہ بنیلا جواب دے وہ لڑکھڑا کر چوبی تخت پہ گر پڑی۔ دمیتا سے آخری بار کچھ کہنے کے لئے اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر زہر اپنا کام کر چکا تھا ـــــ آخری بات اس کی زبان پر موت کی سردی نے منجمد کر دی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا کی تاریکی میں سو گئی۔

کہتے ہیں بنیلا کی لاش کو سامنے رکھ کر دمیتا سنگ تراش نے مردہ حسن سے زندہ حسن پیدا کیا ـــــ اس نے مصر کی اس حسین و جمیل رقاصہ کی تمام رعنائیاں پوشیدہ اور ظاہر ـــــ سنگ مرمر کے ایک بت میں ہمیشہ کے لئے نیند

کر دیں۔

بنیلا کا مجسمہ جب تیار ہو گیا تو لوگوں نے اس کی زبان سے یہ لفظ سنے۔

"یہ عورت اب مجھ سے اور اپنے آپ سے کہیں زیادہ دیر تک زندہ رہے گی۔"

ختم شد